POSTED AT LPC Delhi RMS
ON 10-11 April 2026, R.N.I No. 2186/57

POSTAL REGN. NO. DL (C) - 01/1195/2024-26, Licensed to Post
Without Prepayment U (C) - 160/2024-26, ISSN 2456-8511

Total Pages
8

HAMARI
ZABAN
(Weekly)

ہفت روزہ
ہماری زبان

اشاعت کا 87واں سال

انجمن ترقی اردو ہند

Date of Publication: 09-04-2026 • Price: 5/- • 15-21 April 2026 • Issue: 15 • Vol:85

۱۵تا۲۱/اپریل ۲۰۲۶ء • شمارہ:۱۵ • جلد:۸۵

صحتِ زبان (۴۳)

رؤف پاریکھ

'چاہیے' میں ہمزہ نہیں چاہیے

غالبؔ نے کہا ہے:

چاہیے اچھوں کو جتنا چاہیے
یہ اگر چاہیں تو پھر کیا چاہیے
چاہتے ہیں خوب رُویوں کو اسد
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

چاہیے کے چار معنی ہیں، ایک: مطلوب ہے، درکار ہے۔ دو: لازم ہے، واجب ہے۔ تیسرے معنی ہیں: مناسب ہے، موزوں ہے۔ چوتھے معنی میں چاہیے کا لفظ دراصل مصدر 'چاہنا' کے امر '(تو) چاہ' یا '(تم) چاہو' کی تعظیمی صورت ہے (یعنی آپ چاہیے)۔ چاروں معنوں میں چاہیے کا درست املا یہی ہے جو یہاں لکھا گیا ہے۔ یعنی چاہیے کو ہمزہ کے ساتھ 'چاہئے' نہیں لکھنا چاہیے۔ گویا چاہیے میں ہمزہ نہیں چاہیے۔ عبدالستار صدیقی نے لکھا ہے ''پیجیے، چاہیے، دیجیے، لیجیے وغیرہ میں بھی ہمزہ نہیں بلکہ 'ی' ہے''۔[۱] دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ 'پیجئے'، چاہئے، دیجئے اور لیجئے وغیرہ لکھنا غلط ہے اوران الفاظ کے املا میں ہمزہ کی جگہ 'ی' چاہیے۔

اصل میں ہمزہ کے استعمال کے کچھ اصول ہیں اوران میں سے ایک یہ ہے کہ اگر کسی حرف کے نیچے زیر ہے تو اس کے بعد آنے والے حرف پر ہمزہ (ء) نہیں آئے گا بلکہ 'ی' لکھی جائے گی[۲]، اور چوں کہ 'چاہیے' میں 'ہ' کے نیچے زیر ہے اس لیے یہاں ہمزہ نہیں 'ی' لکھنا چاہیے۔[۳] چاہیے کا درست املا 'چ اہِ ی ے' ہے، نہ کہ 'چ اہ ء ے'۔ اسی طرح جب چاہیے کی جمع لائی جائے یعنی 'چاہییں' تو اس میں بھی ہمزہ نہیں چاہیے۔ یعنی اسے 'چاہئیں' نہیں لکھنا چاہیے۔ بلکہ اس کا درست املا چاہییں ہے یعنی 'چ اہِ ی ے ں' اور اس میں دو بار 'ی' لکھی جائے گی۔

خلاصہ کرنا اور جان کاری یعنی؟

ہندستان میں تو خاصے عرصے سے ذرائع ابلاغ خاص طور پر ٹی وی والے 'وضاحت کرنا' کے مفہوم میں 'خلاصہ کرنا' استعمال کر ہی رہے تھے لیکن خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے کے مصداق اب پاکستان کے ٹی وی والے بھی اس مَرَض میں مبتلا ہوگئے ہیں۔ حال ہی میں پاکستان کے ایک اردو ٹی وی چینل نے خبر دی کہ فلاں معاملے کا فلاں صاحب نے 'خلاصہ کر دیا'۔ پہلے تو ہم سمجھے کہ انھوں نے کسی بات کو مختصراً بیان کیا ہوگا لیکن پھر خیال آیا کہ بھلا اس بات میں کیا خبریت یعنی خبر بنانے والی وقعت یا اَرزِشِ خبری (newsworthinsess) ہے جو ٹی وی پر سرخی میں پیش کی جارہی ہے۔ پھر خیال آیا کہ یہ مانگے کا اُجالا ہے اور پڑوسیوں سے لیا گیا ہے۔

لیکن یہ اُجالا ہے ہی نہیں بلکہ تاریکی ہے کیوں کہ اردو میں خلاصہ کا مفہوم ہے تلخیص، اختصار۔ کسی بات کو مختصراً بیان کرنا ہو تو کہتے ہیں اس کا خلاصہ کرو، بلکہ ہمیں یاد ہے کہ اسکول میں ایک پیراگراف امتحان میں دے کر کہا جاتا تھا کہ اس کا خلاصہ کیجیے۔ یہ سوال انگریزی کے پرچے میں آتا تو اسے precis writing کہا جاتا تھا (پروف ریڈر حضرات کی خدمت میں عرض ہے کہ یہ لفظ precise ہرگز نہیں ہے اس لیے ازراہِ کرم اسے بدلنے کی کوشش نہ کیجیے گا بلکہ اس کا انگریزی تلفظ بھی 'پریسی' ہے) اور ایک استاد نے بتایا تھا کہ کامیاب خلاصے کا راز یہ ہے کہ یہ اصل کا ایک تہائی ہونا چاہیے، یعنی اگر عبارت میں سو(۱۰۰) الفاظ ہیں تو اس کا خلاصہ تینتیس (۳۳) الفاظ میں ہونا چاہیے۔ خلاصے میں کوئی بات دہرائی نہیں جاتی، کوئی اہم بات چھوڑی نہیں جاتی اور کسی غیر اہم بات کو پیش نہیں کیا جاتا، وغیرہ۔

لیکن اس کا کیا علاج کہ اب 'خلاصہ' کا مفہوم بھائی لوگوں نے تلخیص یا مختصر بیان یا مجمل بات کے بجائے وضاحت یا تفصیل ٹھہرالیا ہے یعنی اصل مفہوم کے بالکل الٹ۔ مرحوم شمس الرحمٰن فاروقی صاحب ایسے الفاظ سے بہت نالاں تھے اور اسی طرح کے ایک مرکب 'جان کاری' کے بارے میں انھوں نے لکھا کہ ''اطلاع، معلومات، واقفیت کے مفہوم میں یہ لفظ کم پڑھے لکھے ہندی والوں کی اختراع ہے، اس سے معنی یا معنویت میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا اور یہ بھونڈا اور بدصورت الگ ہے''۔[۴]

اسی طرح فاروقی صاحب نے 'خلاصہ کرنا' کے اس مفہوم (وضاحت کرنا) کو ''غلط اور قبیح'' کہا ہے۔ لکھتے ہیں:

''خلاصہ ہمارے ہاں تلخیص یا مختصر بیان کے معنی میں ہے۔ ...گذشتہ چند برس سے 'خلاصہ کرنا' کو ہندی والے 'بات کی تفصیل بیان کرنا'، 'کسی معاملے کو صاف صاف بیان کرنا'، 'مبہم پہلوؤں کو کھول کر بیان کرنا' کے معنی میں بولنے لگے ہیں اور افسوس کہ اردو میں بھی بعض لوگ اس بدصورت اور گراں محاورے کو برتنے لگے ہیں۔ اسے یک قلم ترک ہونا چاہیے''۔[۵]

ویسے بھی خلاصہ عربی کا لفظ ہے اور اسے ہندی والے جس مفہوم میں چاہیں برتیں، لیکن اس نئے مفہوم کی اردو میں کوئی سند نہیں جس میں ہندی والے اس لفظ کو برتتے ہیں۔

شُہدا اور شُہَدا ء

پچھلی قسط میں لفظ 'لقا' کی بحث میں لفظ شُہدا کا ذکر ہوا تھا اور ہم نے مختصراً عرض کیا تھا کہ شہید کی جمع 'شُہَدا' میں 'ہ' مفتوح ہے یعنی اس پر زبر ہے اور عربی میں تو اس کے آخر میں ہمزہ بھی ہے یعنی شُہَداء۔ اردو میں ایک اور لفظ ہے 'شہدا' لیکن اس میں 'ہ' ساکن ہے اور یہ لچا لفنگا کے معنوں میں رائج ہے۔ اُس وقت تفصیل کا موقع نہیں تھا۔ اب اس کی کچھ تفصیل پیش ہے۔

شان الحق حقی صاحب نے اپنے ایک مضمون ''لفظ شہدا کی اصل'' میں اس پر خوب روشنی ڈالی ہے۔ لکھتے ہیں:

''اردو میں 'شُہدا' روزمرہ کے طور پر آوارہ، شریر، فسادی کے معنی میں مستعمل ہے۔ دنگے فساد کو شُہد پن بھی کہتے ہیں... عربی میں 'شُہَداء' ('ہ' متحرک) شاہد کی جمع ہے، مراد: گواہان۔ شہید کے بھی یہی معنی ہیں اور اس کی جمع بھی شُہَدا ہے۔ لیکن اردو میں اصطلاحاً ان برگزیدہ اشخاص کے لیے استعمال ہوتا ہے جو کسی اعلیٰ مقصد کے لیے اپنی جان دے دیں۔ بعض لوگ شُہدا کو شُہَدا کی بگڑی ہوئی شکل خیال کرتے ہیں۔ ...لیکن مسلمان جو کچھ بھی کریں شُہَدا کی بے حرمتی نہیں کرسکتے۔ کوئی معنوی ربط بھی نہیں۔ بھلا کیوں آوارہ، بدقماش لوگوں کو شُہَدا کے پاکیزہ لقب سے پکارا جاتا''۔[۶]

قارئین! اب 'ہماری زبان' کا مطالعہ انجمن ترقیِ اردو (ہند) کی ویب سائٹ www.atuh.org پر بھی کر سکتے ہیں جہاں اِسے مفت میں ڈاؤن لوڈ کرنے کی سہولت بھی موجود ہے۔

مزید لکھتے ہیں:

''اس لفظ کی اصل کی طرف اشارہ مجھے آچاریہ چانکیہ کے ارتھ شاستر کے اردو ترجمے کے دوران ملا۔ انھوں نے ہاتھیوں کی تربیت کے بیان میں شریر ہاتھی کی ایک قسم شُدّ ھا بتائی ہے۔ لکھتے ہیں: بد ہاتھی، جس کی تربیت بے حاصل ثابت ہو، یا تو شُدّ ھا ہوگا (پکا شریر) یا سَوڑت (چالاک) یا وِشم َ(بد فطرت)۔ بھٹّہ سوامی نے ارتھ شاستر پر اپنی شرح میں لفظ شُدّ ھا پر حاشیہ لکھا ہے: نہایت تیز مزاج، اس میں ۱۸ عیب ہوتے ہیں''[۷]۔

چلیے جناب، یہ تو معلوم ہوگیا کہ شُہدا کی اصل کیا ہے اور یہ برے معنوں میں کیوں ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ سنسکرت سے اردو میں آیا ہے، اگرچہ بگڑی ہوئی شکل میں۔

لیکن سید احمد دہلوی نے فرہنگِ آصفیہ[۸] میں اس کی عجیب ہی اصل بتائی ہے، جس سے اختلاف کیا جا سکتا ہے اور شاید اسی کی طرف حقی صاحب نے اشارہ کیا ہے۔ سیّد احمد دہلوی نے 'شہدا' کے معنی 'شہید کی جمع' لکھے ہیں اور تلفظ کی وضاحت مکتوبی طریقے سے کی ہے یعنی 'ہ' پر زبر لگایا ہے۔ لیکن دوسرا لفظ جو لچا، بدمعاش وغیرہ کے معنی میں ہے اس کا املا 'شہدا' نہیں بلکہ 'شہدہ' کیا ہے، یعنی آخر میں الف کے بجاے ہاے مختفی۔ اس کی سند میں شوق کا یہ شعر دیا ہے:

شُہدے لُچّے موئے خدائی کے
پھِٹے منھ ایسی بے حیائی کے

اس کے بعد انھوں نے اس کی طویل وضاحت کی ہے۔ اس طویل وضاحت کا خلاصہ (یعنی مختصر بیان) یہ ہے کہ یہ لوگ ننگے پاؤں ننگے سر رہتے تھے اور شادیوں میں دلھن کا پلنگ اٹھاتے تھے۔ اول درجے کے شُہدے دہلی کی جامع مسجد کی سیڑھیوں پر بیٹھے رہتے تھے اور ان کی عورتیں بھی گالی گفتار میں یدِ طولیٰ رکھتی تھیں۔ یہ لوگ گالی گلوچ میں مشہور تھے مگر دیانت داری میں بھی مشہور تھے۔ شہدہ (یعنی بدمعاش یا لفنگا) کی وجہِ تسمیہ سید صاحب نے ایک تو یہ بیان کی ہے کہ یہ بات بات پر 'نبی جی' وغیرہ کی قسمیں کھاتے تھے۔ دوسرے یہ کہ جھوٹی گواہی دینے سے بھی انکار نہیں ہوتا تھا اور بقول سید صاحب کے ''چوں کہ شہدا شہید کی جمع ہے جس کے معنی گواہ اور قسم کھانے والا دونوں ہیں پس اردو والے اس کا اطلاق واحد پر بھی کرنے لگے جس کی وجہ سے اس کا املا شہدہ قرار پایا۔''

لیکن حقی صاحب نے شہدا یا شہدہ ('ہ' ساکن، یعنی لچا لفنگا) کا جو اشتقاق بتایا ہے، یعنی سنسکرت کا لفظ شُدّ ھا، وہ زیادہ قرینِ قیاس معلوم ہوتا ہے اور بہتر یہی ہے کہ اسے شہدہ لکھا جائے (آخر میں 'ہ')، یعنی جس طرح فرہنگِ آصفیہ نے درج کیا ہے، تاکہ شہَدا ('ہ' مفتوح) کے مقدس لفظ سے اسے متمیز کیا جا سکے۔

شیوا یا شیوہ؟

اردو میں مستعمل بعض الفاظ کے آخر میں الف لکھا جائے گا یا ہاے مختفی، یہ بحث تو عام ہے اور اب عام طور پر یہ مانا جاتا ہے کہ عربی اور فارسی کے جو الفاظ اردو میں رائج ہیں ان کے آخر میں تو ہاے مختفی (یعنی 'ہ' جس کی آواز الف یا زبر سے مشابہ ہوتی ہے) آسکتی ہے لیکن جو الفاظ سنسکرت یا پراکرت یا ہندی یا خالص اردو کے ہیں، ان کے آخر میں الف ہی لکھا جائے گا اور ان کے آخر میں 'ہ' نہیں آسکتی۔ اس کی ایک وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ ہندی کے ناگری رسم الخط میں ہاے مختفی نہیں ہے اور یہ الفاظ ہندی کے ہیں۔ اس پر رشید حسن خاں صاحب نے اپنی کتاب اردو املا میں خاصی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ شمس الرحمٰن فاروقی صاحب نے ان سے اس معاملے میں جزوی اختلاف کیا اور لکھا کہ جدید ہندی جو ناگری حروف میں لکھی جاتی ہے، اس میں کسی آواز یا حرف کا ہونا یا نہ ہونا اردو کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا اور ناگری رسم الخط میں تو عربی فارسی کے اُن الفاظ کو لکھنے کا کوئی طریقہ ہی نہیں ہے جن کے آخر میں ہاے مختفی ہے، مثلاً ''پردہ، چہرہ، دایہ، سکہ'' وغیرہ اور ان کو ناگری رسم الخط میں ''پردا، چہرا، دایا اور سکا'' ہی لکھا جاتا ہے[۹]۔

لیکن سرِدست ہمارا موضوع یہ نہیں ہے، بلکہ عرض یہ کرنا ہے کہ عربی یا فارسی کے بعض الفاظ ایسے بھی ہیں جن کا املا ملتا جلتا ہے اور ان میں سے ایک کے آخر میں الف ہے اور دوسرے کے آخر میں 'ہ' ہے اور ایسے الفاظ سے متعلق طالبِ علم الجھن کا شکار رہتے ہیں کہ ان میں سے کون سا درست املا ہے حالانکہ اصولاً دونوں درست ہیں کیوں کہ یہ الگ الگ مفہوم کے حامل ہیں۔ ان الفاظ میں شیوا اور شیوہ بھی شامل ہیں۔ دونوں کا املا بہت ملتا جلتا ہے لیکن دونوں کا مفہوم الگ ہے۔ دونوں فارسی کے لفظ ہیں۔

اسٹین گاس کے مطابق شیوا (یاے مجہول اور آخر میں الف) کا مطلب ہے فصیح و بلیغ اور شیوہ (یاے مجہول اور آخر میں 'ہ') کا مطلب ہے ناز، ادا، انداز وغیرہ[۱۰]۔ عبدالستار صدیقی نے لکھا ہے کہ شیوا (آخر میں الف) فصیح کے معنوں میں ہے، جیسے شیوا زبان، مگر ڈھنگ اور حرکات وسکنات کے معنوں میں شیوہ ہے (آخر میں ہاے مختفی)[۱۱]۔ رشید حسن خاں صاحب نے بھی یہی لکھا ہے اور مثال دی ہے کہ بتِ ہزار شیوہ میں یہی شیوہ ہے، یعنی آخر میں 'ہ'[۱۲]۔ اس ترکیب بتِ ہزار شیوہ کے معنی ہیں وہ معشوق جس کے ہزار انداز ہوں۔ مراد یہ کہ محبوب کے نت نئے اور متنوع انداز ہیں، کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ اصل میں کیا ہے، ابھی کچھ ہے اور ابھی کچھ اور۔

اسی لیے اردو میں شیوا زباں کے علاوہ شیوا زبانی، شیوا بیاں اور شیوا بیانی کی تراکیب استعمال ہوتی ہیں جو فصاحت اور بلاغت کی طرف اشارہ ہے۔ لیکن اردو میں جب کہنا ہو کہ اس کی حرکتیں ایسی تھیں یا یہ اس کی عادت تھی تو کہتے ہیں کہ یہ اس کا شیوہ تھا۔

حواشی:

۱۔ مقالاتِ صدیقی (لکھنؤ: اتر پردیش اردو اکادمی، ۱۹۸۳ء)، ص ۱۳۔
۲۔ رشید حسن خاں، اردو املا (دہلی: قومی کونسل براے فروغِ اردو زبان، ۱۹۹۸ء)، ص ۳۹۲ (دوسرا ایڈیشن)۔
۳۔ گوپی چند نارنگ (مرتب)، املا نامہ (دہلی: ترقیِ اردو بیورو، ۱۹۹۰ء)، ص ۸۴ (دوسرا ایڈیشن)۔
۴۔ لغاتِ روزمرہ (کراچی: آج کی کتابیں، ۲۰۰۳ء)، ص ۱۰۰ (اشاعتِ دوم)۔
۵۔ ایضاً، ص ۱۲۵۔
۶۔ لسانی مسائل و لطائف (اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۶ء)، ص ۱۸۰۔ (طبعِ اول)۔
۷۔ ایضاً۔
۸۔ فرہنگِ آصفیہ (مبنی بر چہار جلد) (لاہور: اردو سائنس بورڈ، ۱۹۷۷ء)۔
۹۔ لغاتِ روزمرہ، محولۂ بالا، ص ۲۲۵۔
۱۰۔ A Comprehensive Persian-English Dictionary (مرتبہ ایف اسٹین گاس F. Steingass) (لاہور: سنگِ میل، ۲۰۰۰ء) (عکسی طباعت، اشاعتِ اول ۱۸۹۲ء)۔
۱۱۔ مقالاتِ صدیقی، محولۂ بالا، ص ۶۔
۱۲۔ اردو املا، محولۂ بالا، ص ۶۹۔

ریٹائرڈ پروفیسر، شعبۂ اردو، جامعہ کراچی، یونیورسٹی روڈ، کراچی-75270 (پاکستان)
E-mail: drraufparekh@yahoo.com
Mob. No.: 0322 384 2648

انجمن ترقی اردو (ہند) کی چند مطبوعات

میرے مضامین (مجموعۂ مضامین ومقالات)	ڈاکٹر ماجد دیو بندی	300/-
نسخۂ حفیظ الدین احمد	اطہر فاروقی	1000/-
سرودِ عشق	شاہ رُخ جمال	200/-
گل دوگانہ	سیّد کاشف رضا	300/-
مشائخِ دہلی کی جامع تاریخ	پروفیسر شریف حسین قاسمی	700/-
مقالاتِ نظامی (پانچ جلدیں)	خلیق احمد نظامی	4500/-
نگینے لوگ (خاکوں کا مجموعہ)	معصوم مرادآبادی	250/-
ہمارا شہر اُس برس (گیتا نجلی شری)	ترجمہ: آفتاب احمد	700/-
میں میر میر کر اس کو بہت پکار رہا	سرور الہدیٰ	500/-
1857 کی اَن کہی حیرت انگیز داستانیں	شمس الاسلام	300/-
دیووں کا ظہور (الوک اگروال/ مینک اگروال)	مترجم: سیّد وجاہت مظہر	500/-
غزل اور فنِ غزل	ڈاکٹر نریش	200/-
فرہنگِ تلفظ: ایک تحقیقی وتنقیدی مطالعہ	سیّد رضوان علی ندوی، رؤف پاریکھ	250/-
مشاہیرِ ادب کے خطوط رشید حسن خاں کے نام	ابراہیم افسر	600/-
منیب الرحمٰن کی ایک صدی	بیدار بخت/ انور احمد	400/-
اردو املا اور حروفِ تہجی: لسانیاتی تناظر	رؤف پاریکھ	300/-
رموزِ اوقاف: کب، کہاں اور کیوں؟	ڈاکٹر شمس بدایونی	300/-
غروبِ شہر کا وقت	اُسامہ صدیق	900/-
کچھ اُداس نظمیں	ہربنس مکھیا	300/-
میانِ من وتو (تحقیقی وتنقیدی مضامین)	پروفیسر شاہد کمال	500/-
میرا جنون اردو (خطبات ومضامین)	طاہر محمود	700/-
میر کی خودنوشت سوانح (نثار احمد فاروقی)	صدف فاطمہ	400/-
کلّیاتِ خطباتِ شبلی	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	400/-
آزادی کے بعد کی غزل کا تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر بشیر بدر	500/-
اداریے (مشفق خواجہ)	محمد صابر	500/-
انور عظیم کی ادبی کائنات	فیضان الحق	700/-
بچوں کا گلدستہ (پانچ جلدیں)	غلام حیدر	2400/-
تحقیق وتوازن	ڈاکٹر نریش	250/-
تحقیقی مباحث	رؤف پاریکھ	300/-
چند فکری وتاریخی عنوانات	پروفیسر حکیم سیّد ظل الرحمٰن	400/-
ریت سمادھی (گیتا نجلی شری)	ترجمہ: آفتاب احمد	900/-
حکمِ سفر دیا تھا کیوں	شانتی ویرکول	200/-
عہدِ وسطیٰ کی ہندستانی تاریخ کے چند اہم پہلو	اقتدار عالم خاں	350/-
قدرت کا بدلا (موسم کا بدلاؤ)	سیّد ضیاء حیدر	600/-
کتابیاتِ حالی	ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد	300/-
یہ تو عشق کا ہے معاملہ	ڈاکٹر ہلال فرید	300/-
جب دیوں کے سر اُٹھے	ڈاکٹر ہلال فرید	360/-
سیر المنازل (مرزا سنگین بیگ)	شریف حسین قاسمی	600/-
محرابِ تمنا	فطرت انصاری	200/-
مکتوباتِ مولوی عبدالحق بنام مشاہیر...	میر حسین علی امام، یاسمین سلطانہ فاروقی	700/-
لفظ (کلیاتِ زہرا نگاہ)	زہرا نگاہ	500/-
In This Live Desolation (Autobiography of Akhtarul Iman)	ترجمہ: بیدار بخت	500/-
سخنِ افتخار (کلیاتِ افتخار عارف)	افتخار عارف	1500/-
گواہی (شاعری)	گوہر رضا	500/-
میری زمین کی دھوپ (ہندی)	ونود کمار ترپاٹھی بشر	400/-
کھُلا دروازہ	ڈاکٹر نریش	250/-
ٹیپو سلطان کا خواب (گریش کرناڈ)	محبوب الرحمان فاروقی	300/-
اپنی دنیا آپ پیدا کر	غلام حیدر	900/-

’ممنوع موسموں کی کتاب‘: ایک مطالعہ

پہلی قسط

ڈاکٹر عبد السمیع

اُردو کے معاصر ادبی وشعری منظرنامے میں سیّد کاشف رضا کا نام محتاجِ تعارف نہیں۔ وہ اپنے شعری اور نثری اظہار کے مخصوص لب و لہجے اور پیرایۂ بیان کے لیے اپنی منفرد شناخت رکھتے ہیں۔ ان کی نظم نگاری اور تخلیقی نثر نے اردو قارئین کی ایک بڑی تعداد کو متاثر کیا ہے۔ وہ بنیادی طور پر صحافی اور ترجمہ نگار ہیں لیکن ان کی دو کتابیں ’ممنوع موسموں کی کتاب‘ اور ’چار درویش اور ایک کچھوا‘ اپنی انفرادیت کے سبب خاص اہمیت رکھتی ہیں۔

سیّد کاشف رضا کی نظموں کا مجموعہ ’ممنوع موسموں کی کتاب‘ 2012 میں منظرِ عام پر آیا۔ شمیم حنفی صاحب ان دنوں پاکستان کے سفر پر تھے، غالباً وہیں سیّد کاشف رضا سے ان کی ملاقات ہوئی اور انھوں نے اپنی کتاب دی۔ شمیم حنفی صاحب نے بتایا کہ میں کتاب لانے کی حالت میں نہیں تھا، اس لیے ان سے درخواست کی کہ کتاب میرے دہلی والے پتے پر بذریعۂ ڈاک بھیج دیجیے اور اس طرح یہ کتاب دہلی پہنچ گئی۔ ان دنوں میں نثری نظم پہ کام کر رہا تھا اور شمیم حنفی صاحب کے ذخیرۂ کتب سے استفادہ کی غرض سے اکثر ان کے گھر چلا جاتا تھا۔ یہ کتاب جب ان کے پاس آئی تو مطالعے کے بعد مجھے دیتے ہوئے انھوں نے سید کاشف رضا سے ملاقات اور ان کی علمی و ادبی سرگرمیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ دیکھو اس نوجوان کے یہاں نظم کہنے کا کیا سلیقہ ہے اور تم جس موضوع پر کام کر رہے ہو، اس سے بھی اس کا تعلق ہوسکتا ہے۔ نظم کی یہ کتاب ان کی اجازت سے اپنے ساتھ لے آیا۔ کتاب پڑھنا شروع کی تو اس کے پیش لفظ ’ممنوع موسموں کی کتاب‘ کی نثر متاثر کن معلوم ہوئی۔ پختہ اور تخلیقی نثر اپنی توانائی کا احساس ہر سطح پر کراتی ہے۔ سیّد کاشف رضا کی ناول نگاری کا علم بعد میں ہوا لیکن اس تحریر میں ان کی تخلیقی نثر کی ایک جھلک مل جاتی ہے۔

سیّد کاشف رضا کی شاعری کا اصل موضوع محبت اور نفرت کے درمیانی علاقے میں نمو پانے والا وہ جذبہ ہے جسے کوئی نام دینا مشکل ہے۔ یہاں یہ سوال قائم ہوسکتا ہے کہ کیا محبت اور نفرت کے علاوہ بھی کوئی جذبہ ہوتا ہے؟ اگر ہوتا ہے تو اسے کس نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ عام طور پر محبت اور نفرت ایک دوسرے کی ضد کے طور پر پیش کی جاتی ہیں اور یہ باور کرایا جاتا ہے کہ محبت اور نفرت ہی ایسے جذبات ہیں جن سے انسان کی شخصیت اور اس کے وجود کا مثبت یا منفی اظہار ہوتا ہے مگر محبت کو نفرت میں اور نفرت کو محبت میں تبدیل ہوتے دیر نہیں لگتی۔ سیّد کاشف رضا کی کتاب ’ممنوع موسموں کی کتاب‘ دراصل ان جذبوں کے اظہار پر مشتمل ہے جنھیں نہ تو محبت کا جذبہ کہا جاسکتا ہے اور نہ نفرت کا۔ انھوں نے اپنی کتاب کے دیباچے پر بھی ’ممنوع موسموں کی کتاب‘ کا عنوان قائم کیا ہے۔ ابتدا میں ہی وہ اس نام کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ’’وہاں جہاں مندرج اور نادرج نوشتے محبت کا محل وقوع طے کرتے اور نفرتوں کا حدود اربعہ متعین کرتے تھے کچھ موسموں کو تو ممنوع ہونا ہی تھا۔‘‘[1]

سیّد کاشف رضا نے اپنا دیباچہ جس پیرایے میں لکھا ہے، اس سے ان کی شعریت اور شاعرانہ مزاج کا پتا چلتا ہے۔ شاعری کو تسکین طبع کے طور پر پیش کرنے کی روایت رہی ہے۔ سیّد کاشف رضا خود کو امید پرست تو کہتے ہیں مگر انھیں یہ بھی احساس ہے کہ ان کی شاعری یا کسی بھی تہذیب کا مٹ جانا ہی مقدر ہوتا ہے۔ اپنی شاعری کے جواز کے طور پر انھوں نے جو کچھ لکھا ہے، وہ دلچسپ ہے:

> ’’شاعری اس لیے بھی کرتا ہوں کہ جن صبحوں، شاموں کو جیا ہوں، ان کی گواہی دے سکوں۔ البتہ جانتا ہوں کہ عام سی کوئی تحریر تو کیا زبانیں اور تہذیبیں بھی بالآخر مٹ ہی جاتی ہیں۔ یہ وہ فراموشی ہے جو آنکھوں میں جاگی ہوئی دو پہروں میں نیند گھول دیتی ہے....
> اگر انسان نے موت کے خلاف افزائش نسل سے جدوجہد کی ہے تو فراموشی کے خلاف تحریر کا فن ایجاد کیا ہے۔ شاعری بھی جیے ہوئے لمحوں، فراموشی سے جیتے ہوئے کچھ لمحوں کا حساب رکھتی ہے اور انت میں فراموشی!‘‘[2]

سیّد کاشف رضا شاعری کو محض تفریحِ طبع کا سامان تصور نہیں کرتے بلکہ اپنے تجربات و مشاہدات کے اظہار کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ انھیں یہ بھی احساس ہے کہ یہ شاعری فنا ہوجائے گی جیسے زبانیں، تہذیبیں اور ثقافتیں فنا ہوجاتی ہیں۔ فنا کی حقیقت اپنی جگہ درست ہے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ فنا اور موت کے سامنے زندگی کا تسلسل قائم ہے، جس طرح ایک زندگی موت کو گلے لگاتی ہے لیکن اپنی نسلوں کی صورت میں وہ آگے کا سفر طے کرتی رہتی ہے، اسی طرح شاعری اور تحریر بھی فنا اور فراموشی کے اثرات کو بہت حد تک زائل کرنے میں معاون ہوتی ہے۔ شاعری یا تحریر دراصل اپنی تخلیق کو از سرِ نو دریافت اور بحال کرنے کا عمل ہے، جس طرح زندگی کی مکمل تفہیم مشکل ہے، اسی طرح نظم اور تخلیق کے تمام ابعاد کو گرفت میں لینا دشوار ہے۔ سیّد کاشف رضا نے نظم کی صنعت اور کاریگری پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ’’نظم سے گزرتے ہوئے کبھی بنت کو ادھیڑتے ہوئے سمجھنا ہوتا ہے تو حسن سے گزرتے ہوئے تحلیل اور افزائش کے دورخوں پر اس کی تعبیر سوچنی پڑتی ہے۔ میں حسن سے چہرے منہا بھی کردوں تو جسم اپنی بنت کی کہانی خود سنانے لگتے ہیں۔ اعضا اپنی انفرادی جون پر اصرار کرنے لگتے ہیں اور میں دیوار میں چنی ہوئی ہر اینٹ کے انفرادی توازن کا اندازہ لگاتے ہوئے اس مناسبت کی داد دینے لگتا ہوں جو دیوارِ جمال میں اس کے چنے جانے سے اسے اور اس کی دیوار کو عطا کی ہوتی ہے۔‘‘[3]

نظم کی تفہیم اور اس کے معنی کی دریافت و بازیافت میں قاری جن الجھنوں سے گزرتا ہے اس کا اندازہ اس اقتباس سے لگایا جاسکتا ہے۔ وہ شاعری کو دو رخوں (فنا اور بقا) سے دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یعنی متن کی تفہیم کے طریقے کس قدر مختلف اور متضاد ہوسکتے ہیں اس اقتباس میں اس جانب بھی اشارے ملتے ہیں، تفہیم کے کس رخ پر دیر تک چلنے سے گمشدگی اور گمراہی کا اندیشہ بڑھ جاتا ہے۔

انسانی جسم میں چہرے کی جو اہمیت ہے اس سے سبھی واقف ہیں لیکن حسن صرف چہرے تک محدود نہیں۔ سیّد کاشف رضا حسن کو چہرے سے الگ کرکے دیکھتے ہیں تو انھیں دیگر اعضاے جسمانی کا توازن اسی طرح مسحور کن معلوم ہوتا ہے جس طرح کی سحر کاری چہرے کی موجودگی میں تھی۔ جیسے حسن کو حسن بنانے میں تمام اعضاے جسمانی کا اپنا مخصوص کردار ہے ویسے ہی نظم کو نظم بنانے میں لفظ کے علاوہ اس کی ساخت بھی اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اس بحث میں وہ نظم کی خارجی یا داخلی ساخت اور ہیئت کا تذکرہ تو نہیں کرتے لیکن اشارے اشارے میں وہ ان مباحث کو سمیٹ لیتے ہیں۔ سیّد کاشف رضا کو نظم کی وسعت اور پہنائی کا بھی اندازہ ہے:

> ’’کوئی آئینہ ہوگا جس کی کُہر میں ایک شخص معدوم یا نمودار ہوتا نظر آتا ہے۔ کچھ طرفیں اس کے نقوش کو یک جا کرتی اور کچھ سمتیں انھیں چھینتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ روشنی کی گھٹتی بڑھتی مقدار میں اس کے خدوخال پڑھنے کی کوشش کرتا ہوں اور روشنی میں تحلیل اور تاریکی میں سکوں کوش مرغزاروں کو جمع کرنے کی خواہش کرتا ہوں لیکن ایک نظم کتنی حالتوں کو پہچان سکتی ہے؟‘‘[4]

کاشف رضا نے اپنے دیباچے میں شاعری اور اپنی نظموں کے تعلق سے جو کچھ لکھا ہے وہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اپنے ملک کی سیاسی و سماجی صورتِ حال سے عدم اطمینانی کا اظہار بھی خوب صورت پیرایے میں کیا ہے۔ مجموعی طور پر ان کے دیباچے میں تخلیقی نثر اور شاعرانہ اظہار کی وجہ سے کڑوی اور تلخ باتیں بھی خوب صورت ہوگئی ہیں۔ ان کا انداز شاعرانہ تو ہے ہی، لفظوں کے انتخاب میں بھی ایک خاص سلیقہ اور شعور نظر آتا ہے۔ خاموشی اور فراموشی کا کرب انھیں اندر ہی اندر سُلگاتا اور گھُلاتا رہتا ہے۔ وہ اپنی نظموں کو اس خاموشی اور فراموشی کے خلاف استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ انھیں احساس ہے کہ کتابیں اور تحریریں ہی وہ اشیا ہیں جن کی دنیائیں ختم نہیں ہوتیں۔ اپنی نظموں کو قاری کے سامنے پیش کرتے ہوئے معذرت کا بھی اظہار کیا ہے۔ یہ معذرت نامہ اپنی تخلیقیت اور شاعرانہ اسلوب کے سبب نہ صرف دلچسپ ہوگیا ہے بلکہ اس کا آخری جملہ قاری اور متن کے رشتوں کو ایک نیا زاویہ بھی عطا کرتا ہے:

> ’’اپنے پاس موجود ایک مختصر مہلت میں یہ لفظ کسی عدالت سے کوئی فیصلہ لینے نہیں آئے، آپ کے ساتھ دوستی یاری میں کچھ وقت بتانے آئے ہیں۔‘‘[5]

پانچ صفحات پر مشتمل اس تحریر میں مصنف نے بہت خوب صورتی سے شاعری، اس کی تنقید، شعری رجحانات اور اور تنقیدی رویوں نیز وطن کی سیاسی، سماجی اور معاشرتی و ادبی صورتحال پر روشنی ڈالی ہے۔ لفظوں کی ترتیب اور انتخاب میں تازگی ہے اور قاری کو کتاب میں شامل کلام پڑھنے پر مجبور کرتی ہے۔ اس میں خواہ مخواہ کی علمیت، دانش مندی، منطقی استدلال اور شاعرانہ رعب وداب کے اظہار کی کوشش نظر نہیں آتی بلکہ وہ خاکساری اور بھرپور اعتماد کے ساتھ اپنی بات قاری کے سامنے رکھتے ہیں۔ سیّد کاشف رضا کو نہ تو اپنی شاعری کے تعلق سے خوش گمانی ہے اور نہ وہ اسے نئے اضافے کا نام دیتے ہیں بلکہ بہت سی دوسری تحریروں کے ساتھ اس کے بھی فنا ہونے کی بات کرتے ہیں:

> ’’کہیں بانسوں اور دائروں کا سرکس ہوتا ہے اور کہیں حروف، اوقاف اور شوشوں کا۔ میں، آپ، ہم ٹکٹ پورا ہونے تک تالیاں پیٹ سکتے ہیں اور آنسو بہا سکتے ہیں۔ خیمے اکھاڑے جانے کے بعد مٹی اور ریت پر لکھی ہوئی کہانیاں ہوا پڑھتی ہے اور پھر ان کی خاک اڑا دیتی ہے۔‘‘[6]

...(بقیہ صفحہ 7 پر)

اردو دُنیا

’74 سال قبل بیدر، حیدرآباد میں یکم اپریل کو اردو کے بجائے انگریزی دفتری زبان قرار پائی‘

بیدر (31 مارچ)۔ تاریخ دراصل قوموں کی حیات اور ان کے عروج و زوال کا مدفن ہوتی ہے، جو قوم تاریخ کے اوراق پلٹ کر اپنے ماضی کو دیکھتی ہے وہی قوم ایک بہتر مستقبل کی طرف گامزن ہوتی ہے۔ یہ باتیں اس لیے کہی جارہی ہیں کیوں کہ یکم اپریل 1952 کو بیدر اور اس سے متصل علاقے میں جس کا سیاسی مرکز اُس وقت حیدرآباد تھا، کہا جاتا ہے کہ اردو زبان کے بجائے انگریزی دفتری زبان قرار پائی۔ گویا اردو کے ساتھ ناانصافی کی بنیاد یکم اپریل 1952 کو رکھی گئی۔ یہ بات اردو اور دکنی زبان کے شاعر و ادیب محمد یوسف رحیم بیدری المعروف بہ میر بیدری نے کہی۔ انھوں نے ایک پریس نوٹ جاری کر کے کہا ہے کہ 74 سال قبل یعنی پون صدی قبل اردو کو علاقہ حیدرآباد کرناٹک کے دفاتر سے باہر کیا گیا۔ باوجود اس کے کہ وعدہ کیا گیا تھا اور وقتاً فوقتاً انتخابات سے پہلے وعدے کیے گئے کہ اردو کو دوسری سرکاری زبان بنایا جائے گا لیکن ایسا نہیں ہوسکا۔ بیدر ضلع، حیدرآباد (نظام) سے لسانی بنیادوں پر صوبہ میسور (موجودہ نام کرناٹک) میں لیا گیا۔ دو تین دہائی کے بعد مطالبہ کیا گیا کہ علاقہ حیدرآباد کرناٹک (موجودہ نام کلیان کرناٹک) اور علاقہ ممبئی کرناٹک میں تو کم از کم اردو کو دوسری سرکاری زبان بنایا جائے۔ اُس وقت کی حکومتوں نے اپنا وعدہ وفا نہیں کیا (ایسا ہی مطالبہ بنگلور اور میسور کے اردو حامیوں نے بھی کیا)۔ جنتا پارٹی، کانگریس سے ہوتے ہوئے حکومت کی باگ ڈور جنتا دل، بی جے پی اور جنتا دل (ایس) تک پہنچی۔ اس کے بعد پھر سے اِن دنوں کانگریس کے محبت کے علمبردار ہاتھوں میں ریاست کرناٹک، حکومت کی باگ ڈور ہے تاہم اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کی طرف کوئی توجہ نہیں دی جاتی۔ دیگر ایم ایل اے کے علاوہ خصوصاً 9 مسلم ایم ایل اے بھی اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے پر توجہ نہیں دیتے، جن میں سے بیدر کے وزیر حج اور بلدیہ رحیم خاں اور مائناریٹی وزیر ضمیر احمد خاں بھی شامل ہیں۔ محمد یوسف رحیم بیدری نے سوال کیا ہے کہ کیا ابھی بھی وقت نہیں آیا کہ ریاست کے اردو حامی اضلاع میں اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کا اعلان کیا جائے۔ کب تک حکومتیں مائناریٹی زبان اردو اور دکنی پر ظلم کرتی رہیں گی؟ جناب یوسف رحیم بیدری نے دکنی و اردو شعرا، ادبا اور ریاست کرناٹک کی مائناریٹیز سے اپیل کی ہے کہ وہ اپنی زبان اردو اور دکنی کے حق کے لیے اٹھ کھڑے ہوں۔ 74 سال پہلے تو دفاتر سے اردو کو نکالا گیا لیکن آج تک اس کو دوسری سرکاری زبان کی حیثیت نہیں دی گئی۔ اسی طرح دکنی زبان کی اشاعت اور اس کی تدریس کو بھی حکومتی سطح پر مضبوط و مستحکم کرنے کی ضرورت ہے۔ (سیاسی تقدیر۔ دہلی)

’ہندستان میں جمہوریت کو مضبوط بنانے میں اردو شاعری اور ادب کا کردار‘ پر سمینار کا انعقاد

لکھنؤ (30 مارچ)۔ مقامی مشہور دینی ادارہ دارالعلوم وارثیہ وشال کھنڈ، گومتی نگر، لکھنؤ میں پاٹھ شالہ فاؤنڈیشن اور فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی اتر پردیش کی جانب سے ایک سمینار کا انعقاد کیا گیا، جس کی صدارت سابق کارگزار وزیر اعلا ڈاکٹر عمار رضوی نے کی۔ مہمانانِ ذی وقار کی حیثیت سے آگرہ یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر پروفیسر منظور احمد، خواجہ معین الدین چشتی، بھاشا یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر ڈاکٹر انیس انصاری، کے. ایم. بی یونی ورسٹی شعبۂ اردو کے سابق صدر پروفیسر شفیق احمد اشرفی، بی جے پی اقلیتی مورچہ اتر پردیش کے نائب صدر عمیل شمسی، مہانگر صدر ڈاکٹر شاداب عالم، بی جے پی لیڈر آصف زماں رضوی، اسرار احمد، فرح رضوی وغیرہ شریک ہوئے۔ اپنے صدارتی خطاب میں ڈاکٹر عمار رضوی نے کہا کہ اردو ادب نے ہمیشہ جمہوری اقدار، بھائی چارے اور سماجی ہم آہنگی کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ موجودہ دور میں اردو شاعری اور ادب کے ذریعے عوام میں بیداری پیدا کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ مہمانانِ ذی وقار نے اپنے خطاب میں کہا کہ اردو زبان صرف ایک زبان نہیں بلکہ ہندستان کی مشترکہ تہذیب کی عکاس ہے اور اس کے ذریعے جمہوریت کو مضبوط بنیاد فراہم کی جاسکتی ہے۔ سمینار میں متعدد اہلِ علم و دانشور نے اپنے مقالات پیش کیے، جن میں ڈاکٹر جاں نثار عالم، ڈاکٹر نزہت فاطمہ، عرفان احمد، ڈاکٹر راج کمال گپتا، ایس این لعل، محترمہ عطیہ بی اور ڈاکٹر مسیح الدین خاں وغیرہ شامل تھے۔ مقررین نے اپنے خطابات میں اردو شاعری کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہوئے جمہوری شعور کی بیداری میں اس کے کردار پر روشنی ڈالی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر عمار رضوی کے ہاتھوں سماجی کارکن سعید ہاشمی کو سماجی اور صحافتی خدمات کے اعتراف میں خصوصی اعزاز سے نوازا گیا جب کہ پروفیسر منظور احمد، ڈاکٹر انیس انصاری، پروفیسر شفیق احمد اشرفی، اسرار احمد اور قاری شفیق الحسن وغیرہ کے ہاتھوں یونیورسٹی، کالج اور شہر کی مختلف شخصیات کو اعزاز سے نوازا گیا، جس میں ڈاکٹر عمار نگرامی، ارشاد راہی، افضال صدیقی، ڈاکٹر مسیح الدین خاں، پروفیسر تطہیر فاطمہ، ڈاکٹر نیرج شکلا، ڈاکٹر ہارون رشید، ڈاکٹر عبدالحفیظ، ڈاکٹر سبحان عالم، ڈاکٹر ادریس، شہریار جلال پوری، پروفیسر اسرائیل، ڈاکٹر امتیاز سرجن، نورین زیدی، ڈاکٹر دیوندر شریواستو، ڈاکٹر مدنی انصاری، ڈاکٹر ذیشان حیدر، عبدالسلام ندوی، ڈاکٹر ریاض غنائی، ایس این لعل، عطیہ بی، ڈاکٹر جاں نثار عالم، ڈاکٹر نزہت فاطمہ، راج کمل گپتا، ڈاکٹر رما شکلا، آصف زماں رضوی، فرح رضوی وغیرہ شامل ہیں۔ آخر میں پروگرام کنوینر اونیش اوستھی کی جانب سے تمام مہمانوں اور شرکا کا شکریہ ادا کیا گیا۔ (سیاسی تقدیر۔ دہلی)

مسیحا اُردو سوسائٹی کے زیرِ اہتمام اردو شاعری میں قومی یکجہتی وحب الوطنی پر سمینار

سدھارتھ نگر (31 مارچ)۔ مسیحا اردو سوسائٹی کی جانب سے اتر پردیش اردو اکادمی کے اشتراک سے ایک سمینار کا انعقاد ’اردو شاعری میں قومی یکجہتی وحب الوطنی‘ عنوان کے تحت اٹوا، سدھارتھ نگر میں منعقد کیا گیا۔ سمینار کی صدارت سماجی کارکن اسرار احمد فاروقی نے کی، جب کہ نظامت کے فرائض مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، لکھنؤ کیمپس کے ڈاکٹر مسیح الدین خاں نے انجام دیے۔ پروگرام میں مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے ماہر فزیشین ڈاکٹر توصیف ایچ. خاں نے شرکت کی اور مہمانانِ ذی وقار کی حیثیت سے ابوالہشام خاں، ممتاز صحافی عبدالقدوس، شاعر ہدایت اللہ شمسی، جمال احمد قدوسی شریک ہوئے۔ دیگر مقررین و مقالہ نگاروں میں ڈاکٹر عیاز احمد، ماسٹر شاہد حسین، ماسٹر محمد زبیر، ماسٹر عبدالحلیم، مولانا نعیم ارشد قاسمی، ماسٹر عبدالفرید خاں، ماسٹر اسرائیل، مولانا محمد مسلم، عبارت حسین، ماسٹر احمد، سراج احمد وغیرہ شامل ہیں۔ پروگرام کے آغاز میں سوسائٹی کے سرپرست عبدالحلیم خاں و منتظمینِ پروگرام نے بیج لگا کر مہمانوں کا استقبال کیا۔ سوسائٹی کی جانب سے چار شخصیات کو ان کی نمایاں خدمات کے اعتراف میں ایوارڈ دیے گئے، جن میں سماجی خدمات کے لیے اسرار احمد فاروقی کو، صحافتی خدمات کے لیے ممتاز صحافی عبدالقدوس کو، تدریسی خدمات کے لیے ابوالہشام خاں کو اور سماجی خدمات کے لیے احمد خاں کوشال، مومنٹو اور سرٹیفکیٹ پیش کیے گئے۔ نظامت کرتے ہوئے سوسائٹی کے بانی ڈاکٹر مسیح الدین خاں نے کہا کہ یہ موضوع بہت وسیع ہے، ہماری اردو کی شاعری میں قومی یکجہتی بھری پڑی ہے۔ شعرا نے قومی یکجہتی و حب الوطنی کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ سمینار کے صدر اسرار احمد فاروقی نے کہا کہ یہ سمینار ہمارے یہاں الٹوا میں ہو رہا ہے، ہمیں بہت خوشی ہو رہی ہے کہ اتنے اہم موضوع پر آپ نے سمینار کا انعقاد کیا، آج اردو پوری دنیا میں مقبول ہے اور دن بدن اردو ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ مہمان شاعر ہدایت اللہ شمسی نے اردو شاعری پر اپنا طویل مقالہ پیش کیا اور اردو شاعری کے حوالے سے نثری اور شعری کلام پیش کیا۔ جمال احمد قدوسی نے اظہارِ خیال کرتے ہوئے اپنا شعری کلام بھی پیش کیا۔ دیگر حضرات نے اردو لکھنے پڑھنے پر زور دیا۔ سمینار میں ان کے علاوہ نیاز احمد، دانش مظہر، سراج احمد، احمد خاں وغیرہ موجود تھے۔ پروگرام کے آخر میں سوسائٹی کے سرپرست عبدالحلیم و بانی سوسائٹی ڈاکٹر مسیح الدین خاں نے سبھی حضرات کا شکریہ ادا کیا۔ (سیاسی تقدیر۔ دہلی)

ماہنامہ ’قندیلِ ادب انٹرنیشنل‘ لندن کا مارچ 2026 کا شمارہ منظرِ عام پر

بیدر (30 مارچ)۔ ماہنامہ ’قندیلِ ادب انٹرنیشنل‘ لندن کا ماہ مارچ 2026 کا ادبی شمارہ منظرِ عام پر آچکا ہے، جس کے مدیر رانا عبدالرزاق خاں اور نائب مدیر مبشر شہزاد گلاسکو ہیں۔ شہزاد مبشر گلاسکو اسکاٹ لینڈ کا مضمون ’دوسروں کی بات سننے کا فن‘ نہایت اہم ہے، جس میں انھوں نے کہا ہے کہ ’یہ بات روزمرہ زندگی میں بارہا درست ثابت ہوتی ہے۔ کسی کی بات مکمل سنے بغیر دیا گیا فیصلہ یا ردِّعمل شرمندگی کا سبب بن سکتا ہے۔ اس کے برعکس جو شخص تحمل سے سنتا ہے وہ زیادہ متوازن اور دانشمندانہ رویہ اختیار کرتا ہے۔ سننے کا فن انسان کو عاجزی بھی سکھاتا ہے‘ (ص 18)۔ آصف رشید کا مضمون ’کیا ہم واقعی زندہ ہیں‘ ایک مختصر مضمون ہے جس میں انھوں نے احتساب پر زور دیتے ہوئے لکھا ہے کہ ’اگر آج بھی ہم نے اجتماعی سطح پر خود احتسابی، انصاف، دیانت اور سچائی کو بنیاد نہ بنایا تو کل ہمیں اپنی حالت پر ماتم کرنے کا حق بھی حاصل نہیں ہوگا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم عبادت کو دکھاوے سے نکال کر کردار میں اتاریں۔ تعلیم کو محض ڈگری نہیں بلکہ شعور بنائیں اور ترقی کو صرف اعداد و شمار نہیں بلکہ ان کی بہتری سے جوڑیں‘ (ص 22)۔ پروفیسر طارق گجر نے ’پنجاب کے مسلمان پنجابی کی جگہ اردو بولنا شروع کریں‘ لکھا ہے جس میں انھوں نے نیاز فتح پوری کے حوالے سے کہا ہے کہ ’پنجاب کے مسلمان پنجابی کی جگہ اردو بولنا شروع کردیں اور اپنے بچوں کو ابتدا ہی سے اردو بولنا سکھائیں۔ اول اول تھوڑی سی دقت ضرور ہوگی لیکن چند دن میں اس کی عادت ہوجائے گی اور آئندہ نسل بالکل اردو داں ہوگی‘ (ص 25)۔

غزلیات کے حصے میں پروفیسر مبارک عابد، صابر ظفر، پروفیسر ناصر احمد پرویز، شاذیہ عالم شازی، ڈاکٹر فرزانہ فرحت، ڈاکٹر طارق انور باجوہ، محسن نقوی، رام ریمش، رشید قیصرانی وغیرہ کی غزلیں شامل ہیں۔ نعیم اللہ باجوہ، اطہر زیدی، سیّد معین شاہ کی تحریریں دل کو لبھاتی ہیں۔ مجموعی طور پر یہ شمارہ بھی دلچسپ ہے۔ تشنگی یہ ہے کہ مضامین مختصر ہیں۔ اس شمارے میں مبشر شہزاد گلاسکو نے بتایا ہے کہ ’قندیلِ ادب انٹرنیشنل‘ بیسیوں ممالک میں لاکھوں اردو قارئین کے زیر مطالعہ رہتا ہے۔ اپنی شعری و نثری تخلیقات روانہ کریں، اور یہ کہ آپ کی بھیجی ہوئی تمام تصاویر وغیرہ ’کاپی رائٹ فری‘ ہونی چاہییں۔ (سیاسی تقدیر۔ دہلی)

اردوداں حوصلہ افزا تقریری مقابلے میں نورفاطمہ کامیاب

موتیہاری (31مارچ)۔ضلع اردوزبان سیل،کلکٹریٹ موتیہاری، مشرقی چمپارن کے زیرِاہتمام ضلع سطح پر تین زمرے: میٹرک/مساوی، انٹر/مساوی، بی اے/مساوی اردوداں طلبہ وطالبات حوصلہ افزا تقریری مقابلوں کا انعقاد کیا گیا،جس میں میٹرک زمرے میں ہائی اسکول کودریا، بیلاہی رام،تھانہ پتاہی کی نویں جماعت کی طالبہ نورفاطمہ بنت احمد علی نے 'تعلیم کی اہمیت' کے موضوع پر شاندار تقریر پیش کرتے ہوئے زمرۂ اوّل میٹرک/مساوی میں پورے ضلع میں دوسری پوزیشن حاصل کی۔ان کی اس کامیابی کے لیے اردوزبان سیل کلکٹریٹ موتیہاری کی جانب سے 3500 روپے نقد،توصیفی سرٹیفکیٹ اور میڈل سے نوازا گیا۔نورفاطمہ کی اس شاندار کامیابی پر متعلقہ اسکول کے اساتذہ شمس الضحیٰ خاں،سرگرم رکن آل بہار اردو ٹیچرس ایسوسی ایشن،ہیڈ ماسٹر محمد سمیع اللہ،اشفاق عالم، روی رنجن، پون کمار، آل بہار اردو ٹیچرس ایسوسی ایشن کے جوائنٹ سکریٹری مہر عالم چمپارنی، خازن محمد فیروز عالم،ابوٹا کے سرپرست شکیل شاغل،مولانا آزاد اکیڈمی مونجیا کے استاد آفاق احمد،اشتیاق احمد وغیرہ نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے انھیں دلی مبارک باد پیش کی ہے اور طالبہ کو روشن مستقبل کی دعائیں دی ہیں۔ (سیاسی تقدیر۔دہلی)

اردوادب میں گنگا جمنی تہذیب کی عکاسی پر شاندار سمینار

آگرہ (26 مارچ)۔انجمن حمایتِ اسلام ویلفیئر سوسائٹی، آگرہ کے زیر اہتمام اور حکومتِ اتر پردیش کے مالی اشتراک سے یوتھ ہاسٹل، سنجے پیلس میں یک روزہ قومی سمینار بعنوان 'اردو ادب میں گنگا جمنی تہذیب کی عکاسی' منعقد ہوا۔اس سمینار میں شہر وصوبے کے ممتاز اہلِ علم، دانشور، اساتذہ اور اُدبا نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔سمینار کی صدارت سیّد فیض علی شاہ نیازی (سجادہ نشیں آستانۂ عالیہ، میواکرہ) نے فرمائی، جب کہ مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے بال یوگی (قومی صدر، غریب سینا) شریک ہوئے۔مہمانِ اعزازی کے طور پر سیّد عدنان اشرف (AICC میڈیا انچارج) نے بھی شرکت فرما کر پروگرام کو رونق بخشی۔اس موقعے پر شبانہ کھنڈیلوال،ڈاکٹر سیّد سبطِ حسن نقوی (صدر شعبہ سینٹ جانسن کالج، آگرہ)، پروفیسر محمد معظم خاں، ڈاکٹر سعدیہ سلیم شمسی، ڈاکٹر نسیم اختر اور اظہر عمری (اڈیٹر انچارج روزنامہ 'انکشاف' اردو) سمیت دیگر معزز شخصیات بھی موجود تھیں۔اپنے صدارتی خطاب میں سیّد فیض علی شاہ نیازی نے کہا کہ اردو ادب ہندستان کی مشترکہ تہذیب کا آئینہ دار ہے، جس میں گنگا جمنی تہذیب کی حسین جھلک نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔انھوں نے نوجوان نسل کو اس وراثت سے جڑنے کی تلقین کی۔مہمانِ خصوصی بال یوگی نے اپنے خطاب میں کہا کہ ہندستان کی اصل طاقت اس کی کثرت میں وحدت ہے اور اردو ادب اس وحدت کو مضبوط بنانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔مہمانِ اعزازی سیّد عدنان اشرف نے کہا کہ اردو ادب نے ہمیشہ محبت، رواداری اور بھائی چارے کا پیغام دیا ہے جو آج کے حالات میں مزید اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ شبانہ کھنڈیلوال نے کہا کہ تعلیم ہی وہ مضبوط ذریعہ ہے جس کے ذریعے ہم گنگا جمنی تہذیب کو زندہ رکھ سکتے ہیں۔اردو ادب بچوں میں اعلا اقدار، تہذیب اور انسانیت کو فروغ دیتا ہے۔ڈاکٹر سیّد سبطِ حسن نقوی نے اردو ادب کو علم اور تہذیب کا حسین امتزاج قرار دیتے ہوئے کہا کہ اس میں معاشرے کو جوڑنے کی بے پناہ صلاحیت موجود ہے۔ڈاکٹر سعدیہ سلیم شمسی نے کہا کہ اردو ادب خواتین کی آواز کو تقویت دیتا ہے اور معاشرے میں برابری اور انصاف کا پیغام عام کرتا ہے۔ڈاکٹر نسیم اختر نے کہا کہ گنگا جمنی تہذیب ہماری پہچان ہے اور اردو ادب اس کا سب سے مضبوط ستون ہے۔اظہر عمری نے کہا کہ میڈیا کی ذمے داری ہے کہ وہ اردو ادب اور گنگا جمنی تہذیب کے پیغام کو عام لوگوں تک پہنچائے۔ مقالہ پیش کرنے والے حافظ حبیب، حافظ کلیم الدین، حافظ فیض، حافظ محمد نصراللہ، مولانا کلیم الدین، حافظ محمد نوشاد، محترمہ صائمہ قریشی رحمانی اور محترمہ ملک حسین بی نے اپنے مقالات کے ذریعے گنگا جمنی تہذیب کے مختلف پہلوؤں کو تفصیل کے ساتھ اجاگر کیا اور اردو ادب کی اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالی۔دیگر مقررین نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ گنگا جمنی تہذیب ہماری پہچان ہے اور اردو ادب اس کا سب سے مضبوط ذریعہ ہے۔پروگرام میں طلبہ، اساتذہ اور ادب سے دلچسپی رکھنے والے افراد نے کثیر تعداد میں شرکت کی اور گنگا جمنی تہذیب اور اردو ادب کے تعلق پر سنجیدہ مباحثے ہوئے۔آخر میں منتظمین کی جانب سے تمام مہمانانِ گرامی، مقررین اور شرکا کا شکریہ ادا کیا گیا اور اس عزم کا اظہار کیا گیا کہ آئندہ بھی ایسے ادبی پروگراموں کے ذریعے سماجی ہم آہنگی اور بھائی چارے کو فروغ دیا جائے گا۔ (سیاسی تقدیر۔دہلی)

ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر مراٹھواڑہ یونیورسٹی میں اردو بورڈ آف اسٹڈیز کی اہم نشست

اورنگ آباد (30 مارچ)۔ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر مراٹھواڑہ یونیورسٹی میں اردو و فارسی بورڈ آف اسٹڈیز کی ایک نہایت اہم اور بامقصد نشست ڈاکٹر قاضی نوید احمد صدیقی (صدر شعبۂ اردو، مولانا آزاد کالج) کی زیرِ صدارت منعقد ہوئی، جس میں تعلیمی ونصابی امور پر سنجیدہ اور تفصیلی غور وخوض کیا گیا۔اجلاس میں خاص طور پر بی.اے سالِ سوم کے نصاب کو نیشنل ایجوکیشن پالیسی (NEP) کے تقاضوں کے مطابق ازسرِنو ترتیب دینے کا اہم فیصلہ کیا گیا۔اس ضمن میں اس بات پر زور دیا گیا کہ نصاب کو اس انداز میں مرتّب کیا جائے جو نہ صرف جدید تعلیمی رجحانات سے ہم آہنگ ہو بلکہ طلبہ کی ہمہ جہت علمی، فکری اور تخلیقی صلاحیتوں کو بھی فروغ دے۔مزید برآں بی.اے آنرز (سالِ چہارم) کے نصاب کی تیاری کے لیے بھی ایک جامع اور دوررس لائحۂ عمل وضع کیا گیا۔اس موقعے پر ماہرینِ تعلیم نے اس امر پر اتفاق کیا کہ اعلا تعلیم کے معیار کو بلند کرنے کے لیے نصاب میں تحقیق، تنقید اور تخلیقی بصیرت کو مرکزی حیثیت دی جائے تاکہ طلبہ مستقبل کے علمی وادبی چیلنجز کا بھرپور مقابلہ کرسکیں۔اجلاس میں شریک ممتاز ماہرین اور اراکین میں حسین اختر، خان مقیم خاں، پروفیسر قمرالنسا بیگم، ڈاکٹر مجاہد انصاری، پروفیسر کیرتی مالنی جاوڑے، پروفیسر آصف زکریا، پروفیسر عالیہ کوثر، پروفیسر عتیق احمد قریشی، پروفیسر ساجد انصاری، پروفیسر ساجد احمد قادری اور ڈاکٹر عبدالرب شامل تھے۔تمام اراکین نے نصاب کی بہتری، اس کی افادیت اور عصری تقاضوں سے ہم آہنگی پر زور دیتے ہوئے نہایت قیمتی اور مفید تجاویز پیش کیں۔صدرِ اجلاس ڈاکٹر قاضی نوید احمد صدیقی نے تمام معزز اراکین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس امید کا اظہار کیا کہ نئے سرے سے مرتّب کیا جانے والا نصاب طلبہ کے لیے نہایت سودمند، کارآمد اور مستقبل ساز ثابت ہوگا، اور اردو تعلیم کے فروغ میں ایک سنگِ میل کی حیثیت اختیار کرے گا۔ (سیاسی تقدیر۔دہلی)

اردوا کادمی، دہلی کا سہ روزہ ادبی وثقافتی پروگرام 'سُرسنگم' کامیابی کے ساتھ اختتام پذیر

نئی دہلی (30 مارچ)۔دہلی میں موسم کے ہر لمحے رنگ بدلتے مزاج کے باوجود اردو اکادمی، دہلی کے شاندار سہ روزہ ادبی وثقافتی پروگرام کے تیسرے اور آخری دن شائقین کی ریکارڈ تعداد میں شرکت نے اس پروگرام کی کامیابی میں چار چاند لگا دیے۔'سرسنگم' کے تیسرے اور آخری دن کا آغاز ایک شاندار مشاعرے سے ہوا جس میں ملک کے ممتاز اور سینئر شعرا کے ساتھ ساتھ ابھرتے ہوئے نوجوان شعرا نے بھی شرکت کی۔اس مشاعرے کی نظامت معروف شاعر اور ناظمِ مشاعرہ جناب شکیل جمالی نے کی۔انھوں نے اظہارِ خیال کرتے ہوئے اردو اکادمی کی خدمات اور اس کی متنوع سرگرمیوں کا اعتراف کیا۔انھوں نے کہا کہ اردو اکادمی، دہلی اپنی فعالیت کی وجہ سے ملک بھر میں ایک امتیازی شناخت کی حامل ہے۔اردو اکادمی کے عہدیداران زبان وادب اور تہذیب وثقافت کے فروغ کے لیے خلوصِ دل سے کوشاں ہیں۔ مشاعرے میں شکیل جمالی، راشدہ باقی حیا، اقبال فردوسی، امیر امروہوی اور قاصر سہسوانی جیسے سینئر شعرا کے ساتھ ساتھ سلیم کاشف، فروغ احسن، شاکر دہلوی، خوشبو سکسینہ اور حبیب الرحمٰن جیسے نئی نسل کے نمائندہ شعرا نے بھی اپنے کلام سے سامعین سے بھرپور داد حاصل کی۔مشاعرے کے اختتام پر محکمۂ فن، ثقافت اور السنہ، حکومتِ دہلی کے ایڈیشنل سکریٹری اور اردو اکادمی، دہلی کے سکریٹری جناب لیکھ راج نے تمام شعرا کا استقبال کرتے ہوئے انھیں پودے پیش کیے۔اس کے بعد دوسرا پروگرام 'غزلوں کی سرگوشی' منعقد ہوا جس میں عامر خاں نے اپنی شاندار پیش کش سے سامعین کے دل جیت لیے۔بیچ میں چند لمحوں کے لیے ہونے والی بارش بھی سامعین کو اپنی جگہ چھوڑنے پر مجبور نہ کرسکی، بلکہ ان کی تعداد میں اضافہ ہی ہوتا گیا۔آخر میں درگاہ حضرت نظام الدین اولیا کے درباری قوال حیدر نظامی، حسن نظامی اور عمران نظامی کی قیادت میں نیازی نظامی برادرس کی ٹیم نے اپنی شاندار قوالیوں سے پوری محفل میں سماں باندھ دیا۔ان کی صوفیانہ قوالیوں نے سامعین کو روحانی تسکین سے ہمکنار کیا۔ پروگرام کے اختتام پر جناب لیکھ راج نے مہمان فنکاروں کا استقبال کرتے ہوئے سامعین کا بھی شکریہ ادا کیا۔'سرسنگم' کے تیسرے دن کے تمام پروگراموں کی نظامت کے فرائض اطہر سعید نے دیے انجام۔اس موقعے پر اردو اکادمی، دہلی نے حکومتِ دہلی اور محکمۂ فن، ثقافت والسنہ کے وزیرِ محترم جناب کپل مشرا کے تعاون اور سرپرستی کے لیے خصوصی طور پر اظہارِ تشکر بھی کیا، جن کی حمایت اور رہنمائی سے ایسے ادبی وثقافتی پروگراموں کا انعقاد ممکن ہوسکا۔ (سیاسی تقدیر۔دہلی)

عبدالواحد مخلص پر یک روزہ قومی سمینار کا انعقاد

نئی دہلی 29 مارچ)۔اسلام پور، چوپڑا کالج، چوپڑا، ضلع اتر دیناجپور، مغربی بنگال میں مغربی بنگال اردو اکادمی کے مالی تعاون سے 'مرحوم ماسٹر عبدالواحد مخلص: حیات وخدمات' کے عنوان پر منعقدہ یک روزہ قومی سمینار بہ حسن وخوبی انتہائی کامیابی کے ساتھ اختتام پذیر ہوا۔اس علمی وادبی تقریب کی ایک نمایاں خصوصیت ڈاکٹر علیم الدین شاہ کی مرتّب کردہ اہم کتاب 'بنگالی ہندوؤں کی اردو خدمات' کی ڈاکٹر کفیل احمد نسیم، ڈاکٹر درخشاں زرّیں، ڈاکٹر سجاد عالم رضوی اور دیگر معزز مہمانوں کے ہاتھوں رسمِ رونمائی بھی رہی، جسے اہلِ علم نے بے حد سراہا۔ تقریب کا آغاز مدعو مقالہ نگاروں کی گل پوشی سے ہوا، جنھیں گلدستے پیش کرکے عزت وتکریم سے نوازا گیا۔اس کے بعد مرحوم ماسٹر عبدالواحد مخلص کو منظوم خراجِ عقیدت پیش کیا گیا، جس میں نثار احمد نثار دیناج پوری، شہباز مظلوم پردیسی اور منا مشتاق نے اپنے کلام کے ذریعے مرحوم کی خدمات کو یاد کیا۔افتتاحی اجلاس میں ڈاکٹر مدھوسودھن کرمکار (پرنسپل، چوپڑا کالج) اور ڈاکٹر سجاد عالم رضوی (اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ تاریخ، پریسیڈنسی یونیورسٹی، کولکاتا) نے کلیدی خطبات پیش کیے۔ڈاکٹر مدھوسودھن نے اردو زبان کی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے ماسٹر عبدالواحد مخلص کی اردو کے فروغ کے لیے خدمات کو انگریزی زبان میں خراجِ تحسین پیش کیا، جب کہ ڈاکٹر سجاد عالم رضوی نے اس امر پر زور دیا کہ کسی بھی زبان کی ترقی ریاست، تعلیمی اداروں اور معاشرے کے باشعور افراد کے باہمی اشتراک ...(بقیہ صفحہ 6 پر)

نئی کتابیں

تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے

نام کتاب : شعری افلاک کے ستارے (مضامین)
مصنف : ڈاکٹر ذکی طارق
اشاعت : 2024
ضخامت : 128 صفحات
قیمت : 250 صفحات
ناشر : عرشیہ پبلی کیشنز، دلشاد کالونی، نئی دہلی-110095
تبصرہ نگار : ڈاکٹر ابراہیم افسر

E-mail: ibraheem.siwal@gmail.com

ڈاکٹر ذکی طارق کا شمار اُردو کے اُن ادیبوں میں ہوتا ہے جن کی آبیاری، پرورش و پرداخت میں ان کے گھریلو ماحول نے کلیدی کردار ادا کیا۔ انھوں نے ایسے گھرانے میں آنکھیں کھولیں جہاں اسلامیات و اخلاقیات کا درس انھیں ورثے میں ملا۔ ڈاکٹر ذکی طارق کے والد ماجد متین طارق باغپتی خود اعلا پائے کے ادیب، ناقد و شاعر تھے۔ گھر کے ماحول کی وجہ سے انھیں ادب سے والہانہ شغف پیدا ہوا۔ انھوں نے درس و تدریس کے پیشے کو اختیار کیا اور عوام کو پاکیزہ و صالح معاشرے کے قیام کی جانب راغب کیا۔ ملازمت سے ریٹائر منٹ کے بعد موصوف نے خود کو ادب کے لیے وقف کر دیا ہے۔ سمیناروں و اجلاس میں ان کی موجودگی اس بات کی گواہی ہے کہ ان کے اندر کا ادیب ابھی زندہ ہے۔

زیرِ نظر کتاب 'شعری افلاک کے ستارے'' ڈاکٹر ذکی طارق کی دوسری نثری کاوش ہے۔ اس سے قبل ان کی پہلی نثری کتاب 'اُردو میں منظوم ڈراما' 2017 میں شائع ہو چکی ہے۔ علاوہ ازیں ان کے کئی شعری مجموعے منصۂ شہود پر آ چکے ہیں جن میں احساس کی دھوپ (1983)، پلکوں پہ خواب (2003)، صبح کی دہلیز (2010) وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ 'شعری افلاک کے ستارے' میں ڈاکٹر ذکی طارق نے 15 مضامین کو شامل کیا جنھیں انھوں نے مختلف اوقات میں نذرِ قرطاس کیا۔ اس مجموعے میں انھوں نے بزرگ و ہم عصر شعرا کے کلام و حالات کو اپنی تنقید و تاثرات کا محور و مرکز بنایا ہے۔ ان کے یہ مضامین موقر رسائل و جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔

'پروفیسر عنوان چشتی بحیثیت غزل گو' میں ڈاکٹر ذکی طارق نے ان کی عروض دانی اور شاعری پر بحث کی ہے۔ ان کے بارے میں موصوف لکھتے ہیں کہ ان کا اصل نام افتخار الحسن رکھا گیا جس میں عنوان چشتی کا اضافہ اس قدر مقبول ہوا کہ اصل نام تو خود ان کے قریبی رشتہ دار بھی بھول گئے۔ عنوان چشتی ادب میں شاعری کے ذریعے داخل ہوئے۔ انھوں نے اپنے استاد ابر احسنی گنوری سے شاعری و فن عروض کا درس حاصل کیا۔ ان کی مشہور کتاب 'تنقید نامہ' ہے جس میں اپنے وقت کے تخلیق نگاروں کی تخلیقات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

'منفرد اسلوب کا شاعر: مظفر حنفی' میں ڈاکٹر ذکی طارق نے مظفر حنفی کی غزلوں کا مختلف جہتوں سے جائزہ لیا ہے۔ مظفر صاحب کی غزلوں کے بارے میں ذکی طارق کا خیال ہے کہ ان کی غزلیں ان کے مزاج، ماحول اور اس عہد کی عکاسی کرتی ہیں جس عہد میں وہ جی رہے ہیں۔ مظفر حنفی نے اپنی سادہ و دل کش غزلوں کے ذریعے عوام کو بیدار کرنے کا کام کیا ہے۔ حالاں کہ ان کے کلام میں طنز کی چاشنی اہلِ علم کو بھی متاثر کرتی رہی ہے۔ انھیں شعور کی پختگی اور لہجے میں تنوع اپنے استاد شاد عارفی سے وراثت میں ملا۔ اس کے باوجود روایت و جدت کے امتزاج اور احتجاج نے دیگر شعرا سے ممتاز کیا۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

انا تھی مظفر کی خنجر بکف
وہاں اور کوئی نہ تھا یا اخی

.....

سنئے تو مظفر کا ہر اک شعر کہے گا
میں ٹوٹے ہوئے ساز کی بے چین صدا ہوں

نازش پرتاپ گڑھی کی نظم گوئی کے بارے میں ڈاکٹر ذکی طارق لکھتے ہیں کہ وہ مشاعروں کے بے حد مقبول شاعر تھے جسے عوام نے ان کی وفات کے بعد بہت جلد بھلا دیا۔ انھوں نے مشاعروں میں پابند منظومات اور آزاد منظومات کے ذریعے مقبولیت حاصل کی۔ ان کی نظمیں مشاعروں میں خاصی مقبول ہوئیں۔ ان کی نظموں میں تقسیم کے المیے کو خاص جگہ دی گئی۔ انھوں نے اپنی نظموں کو 'نیا ساز نیا انداز' میں شامل کیا۔ ڈاکٹر ذکی طارق نے اپنے مضمون میں نازش پرتاپ گڑھی کی طویل و مختصر نظموں کا احاطہ سلیقے کے ساتھ کیا ہے۔ وہ اس بات پر نالاں ہیں کہ ہندستان میں کسی بڑے ادیب یا شخص کے انتقال کے بعد اسے بھگوان کا درجہ دیا جاتا ہے لیکن نازش کی وفات کے بعد انھیں بھلا دینا ایک المیہ ہی ہے۔

'آسمانِ ادب کا غزل ستارہ: بشیر بدر' میں ڈاکٹر ذکی طارق نے میرٹھ کے مشاعروں میں بشیر بدر کی آمد، ان سے ملاقاتوں اور اس کے بعد میرٹھ کالج میں ان کی بہ حیثیت استاد تقرری کا ذکر طمطراق کے ساتھ کیا ہے۔ دراصل بشیر بدر جدید شاعری کے نمائندہ شاعر ہیں جنھوں نے مشاعروں اور ادبی دنیا کو ایک عرصے تک متاثر کیا۔ وہ جتنے مقبول مشاعروں میں تھے اس سے زیادہ مقبول ادبی دنیا میں تھے۔ انھوں نے اپنی اختراعی شاعری کے ذریعے غزل کے لب و لہجے کو متاثر کیا۔ ان کی غزلوں میں فرد کی کرب ناکی و تنہائی کے علاوہ معاشرے کو متاثر کرنے والا جادوئی لب و لہجہ بھی ہے۔ بقول ڈاکٹر ذکی طارق بشیر بدر نے اپنے کلام میں تغزل اور جمالیات کو خاص جگہ دی۔ حالاں کہ بشیر بدر کے گھر کا ماحول ادبی نہیں تھا لیکن علی گڑھ میں تعلیم حاصل کرنے اور یہاں کے ماحول نے انھیں شاعری کی جانب متوجہ کیا۔ میرٹھ میں ہوئے فرقہ وارانہ فساد نے ان کی شخصیت اور شاعری دونوں کو متاثر کیا جس کے نتیجے میں انھوں نے میرٹھ کو خیر باد کہا۔ اس موقعے پر ان کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے جس میں ان کے درد کو محسوس کیا جا سکتا ہے:

لوگ ٹوٹ جاتے ہیں ایک گھر بنانے میں
تم ترس نہیں کھاتے بستیاں جلانے میں

.....

شہرت کی بلندی بھی پل بھر کا تماشا ہے
جس ڈال پہ بیٹھے ہو وہ ٹوٹ بھی سکتی ہے

'تنکا تنکا فکر کا ثابت قدم مسافر: پی پی سریواستو رند' میں ڈاکٹر ذکی طارق نے رند صاحب کی زندگی اور شاعری کا بہترین تجزیہ کیا ہے۔ بقول ذکی طارق رند صاحب نے 1944 میں ساغر اجمیری کی شاگردی اختیار کی۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ 'ریگ زار' 1966 میں منظرِ عام پر آیا۔ انھوں نے اپنی شاعری کا آغاز 55-1954 میں کیا۔ حالاں کہ ان کے اب تک 13 شعری مجموعے منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ رند صاحب نے اپنے کلام میں گنگا جمنی تہذیب اور مشترکہ روایات کو خاص جگہ دی۔ دراصل انھوں نے اپنی شاعری میں قومی یکجہتی اور اُردو کی بقا کے پیغام کو عام کیا۔ ان کی غزلوں میں علامتوں، اور پیکر تراشیوں کو عمدہ طریقے سے پیش کیا گیا۔ ان کی شعری زبان میں علامات، تشبیہات، سلاست و روانی کے نمونے جا بجا دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ان کے کلام کے چند نمونے دیکھیے:

انا شناس خرابے جو درمیان میں تھے
وہ لوگ خوش تھے جو دیمک زدہ مکان میں تھے

.....

جب گئے لمحوں نے صدیوں کو گزر جانے دیا
ہم نے بھی تاریخ کو چوکھٹ پہ مر جانے دیا

بہر کیف! ذکی طارق نے 'شعری افلاک کے ستارے' میں اُردو غزل و نظم کے منفرد شعرا کے کلام کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ انھوں نے اپنے افکار و نظریات میں تعلقات کا پاس نہ رکھتے ہوئے تنقیدی اصولوں کو مقدم رکھا۔ ان کی نظر میں شاعر سے پہلے شاعری ہے۔ اس لیے ان کی اس تنقیدی کتاب میں شعریت کو مرکزیت حاصل ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ ذکی طارق کی یہ کتاب شعری تنقید میں دل چسپی رکھنے والے قارئین کے حلقوں میں پسند کی جائے گی۔ ◆◆

عبدالواحد مخلص پر یک روزہ قومی سمینار کا انعقاد

(بقیہ صفحہ 5 سے آگے)

سے ممکن ہوتی ہے اور یہی اصول اردو کے فروغ پر بھی صادق آتا ہے، جس کی جھلک مخلص مرحوم کی تحریروں میں نمایاں طور پر دیکھی جا سکتی ہے۔ افتتاحی اجلاس کے بعد مقالہ خوانی کا پہلا علمی اجلاس منعقد ہوا، جس کی صدارت ڈاکٹر کفیل احمد نسیم (سنٹرل یونیورسٹی آف ساؤتھ گیا، بہار) نے کی، جب کہ نظامت کے فرائض سمینار کے کنوینر ڈاکٹر علیم الدین شاہ (صدر شعبۂ اردو چوپڑا کالج) نے انجام دیے۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر عزیز احمد (اسلام پور کالج)، ڈاکٹر ہارون رشید (دال کولا کالج)، ماسٹر طارق عزیز علیگ، ڈاکٹر صالحہ پروین، جناب دلنواز انجم (مالک شاہین پریس، کشن گنج)، ڈاکٹر اقلیمہ خاتون (عالیہ یونیورسٹی، آن لائن) اور ڈاکٹر شہنواز عالم (اسلام پور کالج) نے اپنے وقیع و بیش قیمت مقالات پیش کیے۔ مقالہ نگاروں نے مرحوم مخلص کی حیات و خدمات کے مختلف پہلوؤں پر تفصیل سے روشنی ڈالی، خصوصاً اردو زبان کے فروغ میں ان کی گراں قدر خدمات، ان کی افسانہ نگاری اور اردو تحریکوں سے ان کی وابستگی کو اجاگر کیا گیا۔ اس موقعے پر مفتی فیروز عالم مصباحی نے بھی اپنے تاثرات پیش کیے اور مخلص مرحوم کی علمی و ادبی شخصیت کو خراجِ تحسین پیش کیا اور سمینار کے کنوینر ڈاکٹر محمد علیم الدین شاہ کو مبارک باد پیش کی۔ پہلے اجلاس کے بعد دوسرا علمی اجلاس منعقد ہوا جس کی صدارت ڈاکٹر درخشاں زرّیں (ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبۂ اردو، عالیہ یونیورسٹی، کولکاتا) نے کی جب کہ نظامت کے فرائض محمد شہباز عالم (صدر شعبۂ عربی، سیتل کوچی کالج، کوچ بہار) نے انجام دیے۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر محبوب عالم، ڈاکٹر ارشاد شفیق، ڈاکٹر طیب فرقانی، ڈاکٹر ابوقاص، افتخار الحق صادق (ریسرچ اسکالر، عالیہ یونیورسٹی) اور جناب قیصر عالم نے اپنے علمی مقالات پیش کیے۔ ان مقالات میں مخلص مرحوم کی افسانہ نگاری کا نسائی اور تانیثی تناظر میں جائزہ لیا گیا، نیز بعض مقررین نے ان سے وابستہ ذاتی یادوں کو تازہ کیا جب کہ بعض نے بطورِ شاگرد ان کی تدریسی خدمات کو بھرپور خراجِ تحسین پیش کیا۔ اجلاس کے دوران مرحوم کے برادران جناب عبدالباسط آتش اور جناب ناصر حسین کو ڈاکٹر درخشاں زرّیں کے ہاتھوں مومنٹو پیش کیے گئے۔ صدارتی خطاب میں ڈاکٹر درخشاں زرّیں نے تمام مقالات کا تجزیاتی جائزہ لیتے ہوئے مقالہ نگاروں کی علمی کاوشوں کو سراہا اور انھیں تبریکات پیش کیں۔

(سیاسی تقدیر۔ دہلی)

’ممنوع موسموں کی کتاب‘: ایک مطالعہ

(بقیہ صفحہ 3 سے آگے)

فنا ہر چیز کی تقدیر ہے لیکن فنا سے پہلے بقایا عارضی قیام کا جو عرصہ ہے اسے اپنے طور پر گزارنے کی آزادی اور اختیار کو سیّد کاشف رضا نے خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان کی شاعری کے بیشتر حصے اسی بڑے اور ہمہ گیر موضوع کے مختلف پڑاؤ معلوم ہوتے ہیں۔ وہ زندگی کو فنا اور بقا کے مختلف تصورات کے تناظر میں بھی دیکھتے ہیں۔ انسانی تجربے اور اس کی بے حسی میں کبھی کبھی یہ چکر مضحکہ خیز بھی ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر کتاب میں شامل پہلی نظم ’مارے جانے والوں کے لیے‘ ملاحظہ کی جاسکتی ہے:

’’یہ سال
ان مارے جانے والوں کے لیے
دعاؤں کے سال کے طور پر منایا جا رہا ہے
جو پچھلے برس مارے گئے

اگلے سال
یہ تمام دن منانے کے لیے
نئے لوگ اور سانحے تلاش کیے جائیں گے

جب مارے جانے والوں کے دن
365 سے زیادہ ہو گئے تھے
ہم نے
انھیں ایک سفاک لکیر سے تقسیم کر دیا تھا

اب ان مارے جانے والوں کے لیے
ایک علاقے میں سوگ
اور دوسرے میں جشن منایا جاتا ہے‘‘[7]

پہلی ہی نظم سے قاری، سیّد کاشف رضا کی نظم گوئی اور انسانی تاریخ و معاشرے پر ان کی گہری نظر کا معترف ہو جاتا ہے۔ نظم بظاہر سادہ ہے۔ ایک رسم کا بیان ہے جسے سچا یا جھوٹا واقعہ کہہ سکتے ہیں۔ خبر اور موضوع سے اختلاف کی گنجائش ہے مگر اس کی صداقت سے انکار ممکن نہیں۔ اس قسم کی رسم کے واقعات کی مثالیں ہماری تہذیبی تاریخ میں بے شمار ہیں۔ آئے دن ہم ایسے واقعات اور یادگار کی خبریں دیکھتے اور پڑھتے ہیں۔ سرحدوں پر اور اندرون وطن مارے جانے والوں کے لیے ایک ہی وقت میں ایک طرف جشن منایا جاتا ہے تو دوسری طرف نوحہ کیا جاتا ہے۔ یہ نظم چار بند پر مشتمل ہے۔ یوں تو ہر بند اپنے آپ میں مکمل ہے لیکن فضا بندی اور رسمیات کے تعلقِ باہم کے سبب دوسرا بند پہلے بند سے لامحالہ متصل ہو جاتا ہے۔

’ممنوع موسموں کی کتاب‘ میں 56 نظمیں شامل ہیں۔ بیشتر نظمیں سیاسی اور سماجی حالات کی پیداوار ہیں۔ اس کا اعتراف خود شاعر نے اپنے پیش لفظ میں بھی کیا ہے۔ شعر یا نظم کی تخلیق میں معاشرہ اور اس کی سفاکیاں کس طرح اثر انداز ہوتی ہیں، اس کا اندازہ لگانا کچھ ایسا مشکل بھی نہیں لیکن یہ جبر جب اندرون کو مسمار کرتا ہے تو ایک گداز اور پرسوز احتجاج کی کونپل پھوٹتی ہے اور پھر یہ کونپل رفتہ رفتہ تناور درخت کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اس سیاق میں سیّد کاشف رضا کی نظم ’مجھے کشتی بنانے کی اجازت دو‘ ملاحظہ کی جاسکتی ہے:

’’اگر تم میری دھرتی کو
اپنے گھوڑوں کی چراگاہ
اپنے شکاری کتوں کی شکارگاہ بنانا چاہتے ہو
تو مجھے ایک کشتی بنانے کی اجازت دو
جس میں لاد کر لے جاسکوں
اپنا کنبہ
خوابوں کی گٹھریاں
اور ایک عورت
جو میرے ساتھ چلنا پسند کرتی تھی
مجھے نکال کر لے جانے دو
گلیاں جن کی
دھول میرے پیروں نے چاٹی
شہر جس کی
خاک میری آنکھوں نے پھانکی
لوگ جو تم سے
اجازت لے کر پیدا نہیں ہوئے
لوگ جو تم کو
اطلاع دیے بغیر مر گئے
مجھے نکال کر لے جانے دو
ٹوٹے ہوئے چولھے
بکھری ہوئی تختیاں
بچے جن کی
قمیصوں میں بٹن نہیں ہوتے
مجھے نکال کر لے جانے دو
میری ماں کی قبر
جسے میں تمھارے گھوڑوں
تمھارے کتوں کے لیے نہیں چھوڑ سکتا!‘‘[8]

(باقی آئندہ)

آہ! کمال الدین

وہ جو ہر رنگ میں دیوانہ رہا

(بقیہ صفحہ 8 سے آگے)

’’میں نے کبھی دہلی کو دیکھا نہیں تھا۔ جب کہ اس کے متعلق بہت کچھ پڑھ چکا تھا اور لوگوں سے سن چکا تھا۔ شام کو رات اپنی سیاہ چادر میں سمیٹ لینے کو بے خود ہو کر دوڑ رہی تھی۔ مجھ میں یہ تمنا جاگی کہ کم از کم لال قلعہ، جامع مسجد اور شام میں چاندنی چوک کا نظارہ کر لوں۔ دھندلی روشنی میں لال قلعہ کی عمارت، اس کی فصیلیں اور برجیاں دیکھیں تو طبیعت بہت خوش ہوئی۔ میں لپکا لپکا جامع مسجد کے سامنے کھڑا ہو گیا، اس کی عظمت و زیبائش اور بلند میناروں، گنبدوں اور دروازوں کو دیکھ کر تاریخ کے صفحات میں کھو گیا۔ اردو زبان کے ارتقاء، غالب اور میر کے اشعار میں متحرک ہو گیا۔ واقعی یہ شاہجہاں کے خلوص، بزرگی اور دلنوازی کا شاہکار ہے۔ دنیا نے بہت لمبا سفر کیا، دلّی اس سفر میں پا بہ جولاں رہی‘‘۔

(چاندنی دھوپ کی، صفحہ 135)

مختصر یہ کہ پروفیسر محمد کمال الدین مرحوم نے اردو ادب کی تحقیق اور تنقید میں قابلِ قدر خدمات انجام دیں۔ انھوں نے خاص طور پر اردو قصیدہ نگاری کے مطالعے کو علمی بنیادوں پر استوار کیا اور اس صنف کے فنی و تاریخی پہلوؤں کو واضح کیا۔ ان کی علمی خدمات کی بدولت متھلا یونیورسٹی کا شعبۂ اردو ایک مضبوط تحقیقی مرکز کے طور پر ابھرا۔ ان کی شخصیت اردو ادب کی اس روایت کی نمائندگی کرتی ہے جس میں علم، تحقیق اور تدریس کو یکجا کر کے زبان و ادب کی خدمت کی جاتی ہے۔ مرحوم بہ ایں معنی بھی ایک خوش قسمت اور کامیاب انسان تھے کہ انھوں نے اپنے چار بیٹوں اور دو بیٹیوں کو اعلا تعلیم سے آراستہ کیا۔ ان کی دونوں بیٹیاں پی ایچ. ڈی ہیں جب کہ دو معالج بیٹوں میں ایک نیرو سرجن اور دوسرے آرتھو سرجن ہیں اور دو دیگر تجارتی شعبے سے منسلک ہیں۔ ان کی خودنوشت کے مطالعے سے یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ مرحوم کی زندگی جدوجہد کی سراپا تصویر تھی۔ وہ دنیا کے تمام تر نشیب و فراز سے صبر و تحمل کے ساتھ دیوانہ وار گزرتے رہے اور انھیں کامرانیاں نصیب ہوتی رہیں اور جب اس دنیا سے رخصت ہوئے تو انھیں ماہِ رمضان المبارک جیسا متبرک مہینہ نصیب ہوا۔ بقول چکبستؔ:

زندگی یوں تو فقط بازیِ طفلانہ ہے
مرد وہ ہے جو کسی رنگ میں دیوانہ ہے

پرنسپل، سی۔ ایم کالج، دربھنگہ (بہار)
Mob. No.: 9431414586
E-mail: rm.meezan@gmail.com

سیر المنازل
(مرزا سنگین بیگ)
شریف حسین قاسمی
قیمت: 600 روپے

کلیم عاجز
تاریخ، یادداشت اور تخلیق
سرور الہدیٰ
قیمت: 500 روپے

میرا جنون اُردو
(خطبات و مضامین)
طاہر محمود
قیمت: 700 روپے

آہ! کمال الدین: وہ جوہر رنگ میں دیوانہ رہا

پروفیسر مشتاق احمد

اردو زبان وادب کی ترقی میں جامعات کے اساتذہ اور محققین کا کردار ہمیشہ بنیادی رہا ہے۔ ایسے اہلِ علم نے نہ صرف تدریس کے ذریعے نئی نسل کی فکری تربیت کی بلکہ تحقیق وتصنیف کے ذریعے ادب کے علمی ذخیرے میں اضافہ بھی کیا۔ بہار کی علمی فضا میں جن شخصیات نے اردو تحقیق وتنقید کو مضبوط بنیادیں فراہم کیں، ان میں پروفیسر محمد کمال الدین (2 مئی 1943 تا 20 فروری 2026) کا نام نہایت احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ پروفیسر کمال الدین مرحوم للت نارائن متھلا یونیورسٹی، دربھنگہ کے شعبۂ اردو کے ممتاز استاد اور بعد میں صدرِ شعبہ رہے اور انھوں نے اپنی علمی زندگی تحقیق، تنقید اور تدریس کے لیے وقف کردی۔ ان کی علمی شناخت خاص طور پر اردو قصیدہ نگاری کی تحقیق سے وابستہ ہے۔ انھوں نے قصیدہ جیسی کلاسکی صنفِ شاعری کو جدید تحقیقی نقطۂ نظر سے دیکھا اور اس کے تاریخی ارتقا، فنی ساخت اور ادبی اہمیت کو واضح کیا۔ مرحوم کا آبائی وطن دربھنگہ ہے، ان کی پیدائش 2 مئی 1943 اسکولی سند کے اعتبار سے موضع حیات پور، بھرواڑہ، ضلع دربھنگہ بہار میں ہوئی تھی۔ ان کے والد مولانا محمد عیسیٰ مرحوم اپنے وقت کے ایک معروف عالمِ دین تھے، اس لیے مرحوم کمال الدین کی ابتدائی تعلیم کا آغاز مدرسہ مظہر العلوم، اسلام پور چھچھوا، ضلع دربھنگہ، (حال ضلع مدھوبنی) سے ہوا۔ بعدۂ انھوں نے اسکولی تعلیم کا رخ کیا اور 1958 میں چودھری کیدار ناتھ ٹھاکر ہائی اسکول، سنگھوارہ، دربھنگہ میں داخلہ لیا جہاں سے 1960 میں میٹرک پاس کیا۔ اس کے بعد وہ پٹنہ کوچ کر گئے لیکن اس وقت پٹنہ یونیورسٹی میں ان کا داخلہ نہیں ہوسکا لہٰذا انھوں نے مگدھ یونیورسٹی، گیا سے انٹر، بی اے اور ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ البتہ آزاد امیدوار کے طور پر پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ سے 1968 میں ایم اے فارسی میں فرسٹ کلاس پوزیشن حاصل کی۔ انھوں نے اردو کے نامور ناقد پروفیسر اختر اورینوی کی نگرانی میں اپنا تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ. ڈی بہ موضوع 'بیسویں صدی میں اردو قصیدہ نگاری از ابتدا تا 1960' مکمل کیا اور انھیں 1972 میں ڈگری تفویض ہوئی۔

یادش بخیر! پروفیسر مرحوم سے راقم الحروف کی پہلی ملاقات 1980 کی دہائی میں ہوئی تھی جب وہ اپنے تدریسی فرائض کے ساتھ ساتھ شہر دربھنگہ کے قلعہ گھاٹ میں ایک کتب خانہ بھی چلاتے تھے جہاں ادبی کتابوں کے ساتھ ساتھ ملک اور بیرونِ ملک کے ادبی رسائل آتے تھے۔ ان کے کتب خانے کے سامنے ہی میرے مرحوم دوست امام اعظم نے ایک 'ادبی سرکل' مرکز قائم کیا تھا جہاں اکثر لکھنے پڑھنے والے اساتذہ اور ریسرچ اسکالر جمع ہوتے تھے۔ اس میں کبھی کبھی پروفیسر کمال الدین مرحوم بھی تشریف لاتے تھے اور اپنی قہقہہ زار گفتگو سے ہم سب کو مستفیض کرتے تھے۔ بعدۂ ان سے مسلسل ملاقات رہی کہ میں بھی بطورِ لکچرر ملّت کالج، دربھنگہ میں تدریسی خدمات انجام دینے لگا اور مختلف کالجوں میں بہ حیثیت پرنسپل اپنی ذمہ داریاں نبھانے لگا۔ وہ جب بھی ملتے بہت ہی محبت اور خلوص سے ملتے۔ اپنی بیشتر کتابیں بھی عنایت کیں اور میں نے ان کی کئی کتابوں پر اپنے رسالہ 'جہانِ اردو' میں تبصرہ بھی کیا اور ان کے تعلق سے مضامین بھی شائع کیے جس کا ذکر انھوں نے اپنی خودنوشت 'چاندنی دھوپ کی' میں کیا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

> ''ڈاکٹر مشتاق احمد پرنسپل سے بھی میرے تعلقات بحمد اللہ اچھے ہیں۔ ابھی حالیہ شمارے میں ڈاکٹر مظفر احمد (امریکہ) کا مضمون 'پروفیسر ایم کمال الدین کا تنقیدی شعور' شائع کیا ہے جس سے ان کی اعلاظرفی کا ثبوت ملتا ہے۔''
>
> (ص:394)

پروفیسر محمد کمال الدین مرحوم طالبِ علمی کے زمانے سے ہی ذہین تھے، اس لیے انھیں ایم اے سالِ اول اور دوم میں یو جی سی فیلوشپ بھی ملی۔ تعلیمی فراغت کے بعد انھوں نے لکچرر شپ جوائن کی۔ پہلے جے بی ایس ڈی کالج، بکوچی کڑا، بہار یونیورسٹی، مظفر پور میں کچھ دنوں تدریسی خدمات انجام دیں پھر سینٹ کولمبا زکالج ہزاری باغ میں تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔ باضابطہ طور پر 5 مارچ 1974 کو سی ایم کالج، دربھنگہ میں ان کی بحالی بہ حیثیت لکچرر اردو و فارسی ہوئی اور انھوں نے صدرِ شعبہ، پھر جب للت نرائن متھلا یونیورسٹی دربھنگہ میں پوسٹ گریجویٹ ڈیپارٹمنٹ کا آغاز ہوا تو بطورِ موسس صدر شعبۂ اردو یکم ستمبر 1979 تا 14 نومبر 1981 اپنے فرائض انجام دیتے رہے۔ پروفیسر مطیع الرحمٰن مرحوم کی بطور صدرِ شعبہ تقرری ہونے کے بعد وہ پھر سی ایم کالج واپس آئے اور 5 اپریل 1995 سے 31 مئی 2003 تک ایل این متھلا یونیورسٹی دربھنگہ کے صدر شعبہ رہے اور یکم جون 2003 سبکدوشی کے بعد سے آخری سانس تک اردو زبان وادب کی آبیاری میں مصروف رہے۔ افسوس صد افسوس کہ 20 فروری 2026 کو انھوں نے اس دنیاے فانی کو الوداع کہا اور مقامی ملّت کالج دربھنگہ کے نزدیک قبرستان میں مدفون ہوئے۔ اللہ ان کے درجات بلند کرے اور ان کے لواحقین کو صبر جمیل عطا کرے۔ آمین

ان کی متعدد کتابیں اردو تحقیق میں حوالہ جاتی اہمیت رکھتی ہیں اور کئی جامعات کے نصاب میں بھی شامل رہی ہیں۔ ان میں 'بیسویں صدی میں اردو قصیدہ نگاری' (1985)، قصیدہ کا فن اور اردو قصیدہ نگاری' (1988)، تنقید کی زبان (2000)، چاندنی دھوپ کی (خودنوشت، 2017) اور شعورِ لاشعور (2020)۔ یہ کتابیں اردو تحقیق، تنقید اور ادبی مطالعے کے میدان میں اہم مانی جاتی ہیں۔ پروفیسر کمال الدین مرحوم نے اپنے ادبی سفر کا آغاز تحقیقی وتنقیدی مضامین کے ساتھ ساتھ انشائیہ نگاری سے کیا تھا اس ہیے ان کی پہلی مطبوعہ کتاب ان کے انشائیوں کا مجموعہ 'ریزۂ خیال' (1979) اردو انشائیہ نگاری کے باب میں غیر معمولی اہمیت رکھتی ہے۔ مرحوم کو شاعری سے بھی شغف تھا اور غزلیں ونظمیں خوب کہتے تھے لیکن میری دانست میں ان کا کوئی شعری مجموعہ شائع نہیں ہوسکا تھا البتہ اپنی خودنوشت 'چاندنی دھوپ کی' میں متوقع مطبوعات کی فہرست میں اپنے شعری مجموعہ 'عضو عضو کرب' کا اعلان ضرور کیا تھا۔

پروفیسر محمد کمال الدین صرف ایک مصنف نہیں بلکہ ایک کامیاب استاد بھی تھے۔ انھوں نے للت نارائن متھلا یونیورسٹی میں کئی دہائیوں تک تدریسی خدمات انجام دیں اور متعدد تحقیقی مقالوں کی نگرانی کی۔ ان کے شاگردوں کی ایک بڑی تعداد بعد میں یونیورسٹیوں اور کالجوں میں بہ حیثیت اردو لکچرر اردو زبان وادب کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اس طرح ان کی علمی روایت آگے بڑھتی رہے گی۔ وہ ایک تحقیقی اندازِ تدریس، کلاسکی ادب پر مضبوط گرفت، طلبہ میں تنقیدی شعور پیدا کرنا ضروری سمجھتے تھے۔ اردو ادب میں پروفیسر محمد کمال الدین کا مقام ایک محقق، نقاد اور استاد کی حیثیت سے تسلیم کیا جاتا رہے گا۔ خاص طور پر قصیدہ نگاری کی تحقیق میں ان کی خدمات بہت اہم ہیں۔ ان کی کتاب 'قصیدہ کا فن اور اردو قصیدہ نگاری' آج بھی اردو تحقیق میں ایک مستند حوالہ سمجھی جاتی ہے اور کئی جامعات کے نصاب میں یہ کتاب شامل ہے۔ ان کی تحریروں کے مطالعے سے حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ ان کی تحریروں میں تحقیقی سنجیدگی، تاریخی شعور، تنقیدی توازن، سادہ اور واضح اسلوب کے عناصر شامل ہیں جو انھیں اپنے ہم عصروں سے منفرد کرتے ہیں۔ وہ شخصی اعتبار سے بھی بہت دلچسپ گفتگو کرتے تھے اور ان کی گفتگو میں بھی طنز ومزاح کے عنصر دلچسپی کے باعث ہوتے تھے۔ چوں کہ مرحوم اردو کے ساتھ ساتھ فارسی زبان میں بھی درک رکھتے تھے اس لیے فارسی کے اشعار برمحل استعمال کرتے تھے۔ ان کی خودنوشت 'چاندنی دھوپ کی' ان کی نثر نگاری کا اعلا نمونہ ہے۔ یہاں ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے جس سے یہ اندازہ ہوگا کہ مرحوم کا طرزِ تحریر کیا تھا:

...(بقیہ صفحہ 6 پر)

ادارہ کا مضمون نگاروں کی آرا سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے (ادارہ)

مدیر : اطہر فاروقی
Editor : Ather Farouqui
شریکِ مدیر: محمد عارف خاں
Joint Editor : Mohd. Arif Khan
معاون مدیران: منور حسن کمال، سالم فاروق ندوی
Assisistant Editors :
Munawwar Hasan Kamal, Salim Farooq Nadwi
پرنٹر پبلشر : عبدالباری
Printer Publisher : Abdul Bari
مطبوعہ : جاوید پریس، 2096، رودگراں، لال کنواں، دہلی-۶
مالک : انجمن ترقی اردو (ہند)
اردو گھر، 212، راؤز ایونیو، نئی دہلی-110002
Proprietor:
Anjuman Taraqqi Urdu (Hind)
Urdu Ghar, 212-Rouse Avenue,
New Delhi-110002
قیمت : فی شمارہ: پانچ روپے، سالانہ: 200 روپے
بیرونی ممالک: آٹھ امریکن ڈالر
Subscription: (Per Issue): Rs. 5/-, Annual: 200/-
(Foreign Countries: US $ 8)
E-mail: hamarizaban.weekly@gmail.com
http://www.atuh.org,
Phones: 0091-11-23237722

Printed and Published by ***Abdul Bari*** on behalf of Anjuman Taraqqi Urdu (Hind), Urdu Ghar, 212, Rouse Avenue, New Delhi-110002
and Printed at Javed Press, 2096, Rodgran, Lal Kuan, Delhi-110006, Editor: ***Dr Ather Farouqui***